۷

دارالعلوم حقانیہ " اکوڑہ خٹک " کا علمی و دینی

ماھنامہ

زیر سرپرستی

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق بانی و مہتمم دارالعلوم حقانیہ

اکوڑہ خٹک (پشاور)

خراجِ تحسین

از حضرت العلامہ محقق العصر مولانا شمس الحق افغانی مدظلہٗ
سابق وزیر معارف قلات شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ۔ میں نے دار العلوم حقانیہ سے ماہوار شائع ہونے والا رسالہ الحق کو دیکھا۔ ایک ماہوار دینی رسالہ کی افادیت کیلئے امور ذیل کی ضرورت ہے ۔۔۔

۱۔ اسکے مضامین علمی اور معیاری ہوں ۔ ۲۔ دین کی عصری ضرورتوں کو پورا کرتا ہو ۔ ۳۔ اس میں دین کی جہات اور بنیادی حقائق پر زیادہ زور صرف کیا گیا ہو ۔ ۴۔ مضامین میں کتاب سنت کے آسمانی نور کے ساتھ ساتھ عقلی جھلک بھی موجود ہو تاکہ وہ اس دورِ عقلیت کے اذہان کو متاثر کر سکے ۔ ۵۔ دین سے متعلق صرف ان شبہات کے ازالہ کی طرف توجہ مبذول کی گئی ہو جو موجود اور محقق ہوں نہ ایسے شبہات جو ہم خود پیدا کریں ۔ اور پھر اس کا جواب لکھیں کیونکہ ایسا کرنا فتنہائے خوابیدہ کا فتح باب ہے جو بجائے مفید ہونے کے مضر ہے ۔ ۶۔ جملہ مضامین میں اس مرکزی تصوّر کو پیشِ نظر رکھا گیا ہو کہ قارئین رسالہ کے ذہن میں خشیۃ اللہ ، عظمتِ دین ، اور اہتمامِ آخرت کی روح پیدا ہو ۔ ۷۔ مضامین کی تعبیر شستہ ، عام فہم ہو الجھا ہوا نہ ہو ۔۔۔۔ ان امورِ ہفتگانہ کے پیشِ نظر رسالہ الحق کا انداز پُر امید ہے ۔ اور موجودہ آغاز سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ الحق اصولِ مذکورہ کے تحت معیاری اہلیّت کی راہ پر گامزن ہے ۔ اور اب بھی بہ نسبت دیگر رسائل ایک بہت بڑی حد تک کامیاب ہے ۔ محبتِ دین کا تقاضا ہے کہ مسلمان ایسے مضامین کی اشاعت میں دلچسپی لیکر اس رسالہ کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ حق کی یہ روشنی پھیل جائے اور مسلمانوں کے دل و دماغ اس سے منوّر ہوں ۔ فقط والسلام

۔۔۔ شمس الحق افغانی عفا اللہ عنہٗ ۔۔۔

قرآن وسنّت کی تعلیمات کا علمبردار

لہٗ دعوۃ الحق

ماھنامہ
الحق
اکوڑہ خٹک

فہرست مضامین

جلد نمبر ۱ | رمضان المبارک ۱۳۸۵ھ | جنوری ۱۹۶۶ء | شمارہ نمبر ۴ | فی پرچہ پچاس پیسے | سالانہ چندہ چھ روپے | غیر ممالک سے سالانہ ۱۶ شلنگ

شذرات

رمضان المبارک کا مہینہ اپنی پوری رحمتوں اور عظمتوں سے ملت اسلامیہ پر سایہ افگن ہے۔ اس شہر عظیم کی برکات کے کیا کہنے جس میں قرآن عظیم اتارا گیا۔ اور جس کے اہتمام و استقبال میں سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر فرط اشتیاق سے والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ قرب حق اور وصال مولیٰ کے وہ پاکیزہ شب و روز جن کی خنک لہروں سے روح و ایمان کی کھیتی لہلہا اٹھتی ہے۔ اور جن کے عبادات و مجاہدات سے نہ صرف مہینہ بھر کے لئے نفس ظلوم اور شیطانی طاقتیں مقہور و مغلوب ہو جاتی ہیں۔ بلکہ خوش بخت افراد کا یہی جمع شدہ ذخیرۂ عبادات سال بھر تک ذخیرۂ توفیق و برکت کا کام دیتا رہتا ہے۔ اور اسکی طاعتوں اور مغفرتوں کا فیض سال بھر تک چلتا رہتا ہے۔ یہی وہ مبارک مہینہ ہے جس میں ایک طرف انسانی رہنمائی و ہدایت کا نسخۂ شفاء قرآن مجید کی شکل میں اتارا گیا۔ تو دوسری طرف ضروری تھا کہ ساتھ ہی ساتھ اس "کتاب مبین" پر عمل کرنے کی تربیت کا اہتمام بھی ہو اور اللہ کے اوامر کی تعمیل اور نواہی سے اجتناب خواہشات نفسانی کے مغلوب کرنے اور ملکوتی جواہر کو اجالنے اور نکھارنے کی صلاحیت اور طور طریقے بھی عملاً سکھائے جائیں جس کا بہترین مظاہرہ روزہ ہی کے ذریعہ کیا جا سکتا تھا کہ جب ارشاد ربانی کی تعمیل میں حلال اور پاکیزہ نعمتوں اور کھانے پینے سے اجتناب اور احتراز کی طاقت پیدا ہو جائے گی تو ناممکن ہوگا کہ ملت محمدی کا ایک پیرو اور عبدیت خداوندی کا ایک دعویدار اپنی زندگی میں اس کی مرضی اور منشاء کے خلاف کوئی حرکت کر بیٹھے۔ یہی ربط اور تعلق ہے رمضان اور قرآن کا۔ قرآن کریم ایک مؤمنانہ سیرت و کردار کیلئے جن خطوط و اقدار کی تعلیم دیتا ہے۔ اس تعلیم کے سیکھنے اور پڑھنے پڑھانے، اس کے عملی تجربہ اور ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے جو تعلیمی مدت مقرر کی گئی وہ یہی ماہ رمضان ہے۔ اطاعت و پرہیزگاری کو اپنا کر خواہشات و شہوات کی تمام طاقتوں کو مولیٰ کے نام پر قربان کرنا روزے کا یہی پاکیزہ مقصد ہے، جسے قرآن میں تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ "اے مسلمانو! تم پر روزے فرض کئے گئے جسطرح پچھلی امتوں پر فرض کئے گئے تاکہ تم میں تقویٰ پیدا ہو" (البقرہ) وہی تقویٰ جو بقول علامہ سید سلیمان ندوی علیہ الرحمۃ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے اور جسکی حقیقت سیدنا عمر بن الخطابؓ کی روایت ذیل سے سمجھی جا سکتی ہے:

عن عمر بن الخطابؓ انہ سال اُبَیّ بن کعب عن التقوٰی فقال لہ اما سلکت طریقا ذا شوك؟ قال بلیٰ قال فما

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ انہوں نے اُبَیّ بن کعب سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ آپ ایسے راستے سے نہیں گزرے ہیں

عملت؟ قال شمرت واجتھدت جہاں کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔ آپ نے کہا ہاں
قال ذالک التقوی۔ (تفسیر ابن کثیر جلد اول صفحہ ۴۲) گذرا ہوں۔ انہوں نے پوچھا پھر اسوقت آپ نے
کیا کیا۔ فرمایا میں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور اس سے بچتا ہوا گذر گیا۔ انہوں نے کہا اسکا نام تقویٰ ہے۔

پس اگر ہم نے ان ایام میں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ تمام غلط باتیں بھی ترک کر دیں منکرات و فواحش سے کلی احتراز کیا جھوٹ حرامکاری گالی گلوچ غیبت چوری قول زور لہو و لعب اور نظر بد وغیرہ کو خیر باد کہہ کر اپنی تمام توانائیاں خدا کے سپرد کر دیں تو ہم نے روزے کا مقصد اور تقوی کی زندگی پالی۔ اور اگر گناہ و معصیت کا بازار گرم رکھا۔ کلچر و ثقافت کے نام پر فحاشی اور بے حیائی کا کاروبار چلتا رہا۔ دفاع و ریلیف فنڈ کے نام پر رقص و سرود کی محافل منعقد ہوتی رہیں۔ اور ہماری صحافت و ثقافت، ہمارے ممتاز اخبارات و جرائد چند ٹکوں کی خاطر فحش تصاویر برہنہ اشتہارات اور راگ رنگ کے حیا سوز مناظر کی غلاظتیں مسلم گھرانوں اور مومن معاشرے میں برابر پھیلاتے رہے جیساکہ جنگ کے فوراً بعد دوبارہ ہوا۔ یہاں تک کہ ملک کے اہم اخبارات اشاعت فواحش کے دور میں غلاظت کے پلندے اور چلتے پھرتے قحبہ خانے بن کر رہ گئے۔ اور ایک مسلمان تو کیا کوئی غیرتی انسان ان اخبارات کو اپنے گھر میں داخل کرنے میں شرم و عار محسوس کرے گا۔ ہمارے سینما گھر بدستور شیطانی تعلیم گاہیں بن کر قوم کے اخلاق و شرافت کو غارت کرتے رہے۔ ہر بازار اور گلی میں رمضان ہی کے نام پر پردہ کی اوٹ میں روزہ کی تذلیل و توہین ہوتی رہی تو ایسی قوم حقیقۃً روزہ دار اور متقی نہیں اور نہ یہ طور طریقے ایک مجاہد قوم کے ہیں۔ زبان سے صائم (روزہ دار) اور مجاہد، روزہ اور جہاد کا دعویٰ اور زندگی کے ہر شعبہ اور ہر عمل اسلام و اطاعت کیلئے ایک کھلا چیلنج؟ سچ کہا حضورؐ نے "کتنے روزے دار ایسے ہیں جنکو اپنے روزہ سے بھوک اور پیاس کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔" —— خدا کی جائز کی ہوئی چیزوں سے روزہ رکھ کر خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں سے اس کا افطار کرنا کہاں کی عقلمندی ہے —— ؟
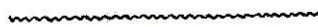
جہاد کے بعد روزہ —— اللہ اکبر —— اگر روزہ کی عظمت و حقیقت کو جان کر اس کے مقصد و مفہوم کو اپنا لیا جائے تو اسی ایک مہینہ کو جہاد اور فتح و کامرانی کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے! اور ہر بالغ روزہ دار آگے چل کر ملت پاکستانیہ کا عظیم سپاہی اور باطل کیلئے خدائی تلوار بن سکتا ہے۔ کہ جب روزہ دار حق کی راہ میں کھانا پینا چھوڑ سکتا ہے، لذت و آرام عیش و راحت کے تمام تقاضوں کو خدا کی راہ میں پائمال کر سکتا ہے سردیوں کی طویل راتوں کی میٹھی نیند کو قیام لیل تلاوت قرآن اور نوافل و عبادات کی خاطر قربان کر سکتا ہے۔ اور دین کی خاطر اپنے تمام مشاغل و معمولات میں ہر قسم کی تبدیلی کے لئے آمادہ ہے۔ تو کیا ایسا شخص ضرورت کے وقت کلمۂ حق کی اعلاء اپنے دین و ملک

کی حفاظت اور باطل کے استیصال کی خاطر دشمن کے سامنے سینہ سپر نہیں ہو سکے گا۔ اور جب مسلمان روزہ کے ذریعہ اپنے داخلی دشمن "نفس" پر قابو پالیتا ہے۔ تو کیا وہ خارجی دشمن کی سرکوبی نہیں کر سکے گا۔؟ یقیناً کرے گا۔ کیونکہ اپنی اندرونی خواہشات اور ہوائے نفسانی کو دبا دینا کٹھن اور مشکل کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث میں روزہ کو شہر الصبر (صبر کا مہینہ) اور بیرونی دشمن کے مقابلہ میں جان و مال کی قربانی کو جہادِ اصغر اور نفس و خواہش کی بیخ کنی کو جہادِ اکبر سے تعبیر کیا گیا۔ اور جب حضورِ اقدسؐ ایک جہاد سے واپس ہوئے تو فرمایا رجعنا من الجہاد الاصغر الی الجہاد الاکبر (ہم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کیطرف لوٹے) اسلئے کہ محاذِ جنگ میں خارجی و بیرونی دشمنوں سے لڑائی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو مگر ایک وقتی اور عارضی چیز ہوتی ہے۔ لیکن نفس و شیطان کا مقابلہ پوری زندگی کا دائمی اور ہمہ وقتی عمل ہے اور اس سے عہدہ برآ ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں اور جب اندر کی دنیا سنور جائے گی۔ اور اندرونی دشمن نفس کو کچل دیا جائے گا تو بیرونی دشمن آنکھ اٹھانے کی جرأت بھی نہ کر سکے گا۔ جب ایک مسلمان اس ملکوتی اور روحانی اسلحہ سے مسلح ہو کر میدان میں اترے گا اور کفر و باطل کو للکارے گا تو حیوانی اور شیطانی صفت بہیمیت اور درندگی سے بھرپور ظالم اور کافر قوتیں لرزہ براندام اٹھیں گی۔ یہی وہ عظیم حکمتیں ہیں جو اسلام کے اس اہم رکن "صیام رمضان" سے وابستہ ہیں۔ اور جن کی فضیلت کے زمزمے اور ترانے خود حضورِ اقدسؐ کی زبانِ حق ترجمان سے گونج اٹھے۔ اور ایک مستقل خطبہ آخر رمضان میں ارشاد فرمایا جسے بیہقی نے حضرت سلمان فارسی سے ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے:

"اے لوگو! تم پر ایک عظمت والا مہینہ سایہ گستر ہوا ہے۔ ایک برکت والا مہینہ، وہ مہینہ جس میں ایک رات ہزار راتوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میں روزے فرض کئے ہیں۔ اور قیام لیل (تراویح) نفل رکھی ہیں۔ جس نے اس مہینہ میں کوئی بھی نیکی کی وہ ایسا ہے کہ کسی شخص نے سوائے رمضان کے بقیہ سال میں کوئی فریضہ ادا کیا اور جس نے اس ماہ میں فرض عبادت کی تو گویا اس نے غیر رمضان میں ستر فریضے ادا کئے۔

پرچہ "الحق" تکمیل کے مراحل میں تھا کہ مجسمۂ علم و عمل محدثِ وقت فقیہ بے بدل شیخ العصر جامع شریعت و طریقت بقیۃ السلف حضرت شیخ الحدیث مولانا عبد الرحمٰن صاحب (بہبودی ضلع کیمبل پور) کی وفات کا سانحۂ فاجعہ پیش آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ حضرت مرحوم پر ۱۰ر دسمبر بروز جمعہ نمازِ تہجد کے دوران اچانک دائیں طرف فالج کا حملہ ہوا دوسرے دن آپ کو کنٹونمنٹ ہسپتال راولپنڈی میں داخل کرایا گیا۔ بہترین اور ماہر ڈاکٹروں نے ممکنہ کوششیں کیں۔ ابتداء میں صحت سنبھلی پھر بگڑتی چلی گئی اور حضرت کی زندگی کا ٹمٹماتا چراغ بالآخر ۱۲ر دسمبر کو ۴ بجکر پینتیس منٹ پر گل ہو گیا۔ کیا عجب کہ اُسوقت عالمِ بالا میں یہ صدا گونجی ہو کہ یا ایتہا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی۔

وصال کا سانحہ ہائلہ راستہ ہی میں پیش آیا جبکہ صحت سے مایوس ہو کر آپ کو پنڈی سے آبائی گاؤں بہبودی لایا جا رہا تھا۔ اور اسطرح علم و عمل تقویٰ اور تصوّف کا وہ روشن ستارہ غروب ہوا جسکی روشنی اور تابناکی سے نصف صدی تک علم و عمل کے ایوان جگمگاتے رہے۔ اور جس سے ہزاروں تشنگانِ علم سیراب ہوئے۔ کل من علیہا فان اللہم اجرنا فی مصیبتنا واخلف لنا خیرا منہا۔ ۲۲ دسمبر بروز بدھ دو بجے نماز جنازہ ادا کی گئی۔ نمازِ جنازہ حضرت شیخ الحدیث مولانا نصیر الدین صاحب مدظلہ (غورغشتی) نے پڑھائی اور بیشمار علماء و صلحاء و عقیدتمندوں نے شرکت فرمائی۔ دار العلوم حقانیہ سے حضرت شیخ الحدیث کے علاوہ کئی اساتذہ اور مقامی اراکین نے شرکت کی۔ نمازِ جنازہ کے بعد حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ اور دیگر علماء کرام نے مرحوم کے مناقب و کمالات پر روشنی ڈالی۔ اور مرحوم کی ذات کو علم و عمل شریعت و طریقت کا مجمع البحرین اور انکی جدائی کو علمی و روحانی دنیا کیلئے عظیم خلا قرار دیا۔ مولانا مرحوم کی ذات برصغیر میں بقیۃ السلف تھی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی کے تلمیذ رشید حضرت علامہ انور شاہؒ کشمیری اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری شارح ابی داؤد کے محبوب شاگرد، حضرت اقدس سیدنا شاہ عبدالرحیم رائے پوری کے منظورِ نظر اور حضرت حکیم الامت شاہ اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کے چہیتے خلیفہ اجل ——— ہیں علم و حکمت، اخلاق و کردار، تقویٰ و طہارت کی تمام صفات موجود تھیں زندگی بھر علم و حکمت ان کا زیور اور حیا و شرافت ان کا لباس رہا۔ حیات مستعار تدریس و تبلیغ اصلاح و ارشاد میں بسر ہوا زندگی بھی پاکیزہ اور موت بھی رشک آفریں۔ طاب حیاً و میتاً۔ بعد وفات چہرہ پر عجیب طمانیت اور نورانیت پائی جاتی تھی۔ اور محبوبیت و دلکشی، مسکراہٹ اور دل آویزی کا وہی عالم جو عمر بھر ان کا وصفِ خصوصی رہا غرض خصائص و کمالات کی ایک دنیا تھی جو اس جسد خاکی میں سمٹ گئی تھی۔ مولانا کے یہی اوصاف مدت تک لوگوں کو رُلاتے رہیں گے۔ علمی شغف و انہماک تبحّر و تعمّق کے ساتھ تواضع و فروتنی ہر لمحہ اتباع سنت کا جذبہ اور اصلاح نفس و ہدایت خلق کی انتھک سعی مولانا مرحوم کی زندگی کے وہ درخشاں نقوش و خطوط ہیں۔ جن پر حضرت مرحوم کے تلامذہ متوسلین و مریدین اور عقیدتمند چل کر سرمایۂ دارین حاصل کر سکتے ہیں۔ دار العلوم حقانیہ اور ادارۂ الحق حضرت مرحوم کے سانحۂ ارتحال میں حضرت مرحوم کے تمام متعلقین صاحبزادگان و دیگر اعزّہ کے ساتھ اس صدمہ میں برابر کا شریک اور حضرت مرحوم کے رفع درجات کا متمنّی ہے۔ خود غمزدہ راقم تو برادرِ عزیز مولانا قاری سعید الرحمن صاحب اور دیگر برادران کے تعلق کی بنا پر مشفق سرپرست سے محروم ہو گیا ہے اور خود تعزیت کا مستحق ہے ——— اللہ تعالیٰ برادر مکرم اور دیگر برادران کو اس صدمۂ عظمیٰ کے تحمل و برداشت کی توفیق دے اور اولو العزم والد بزرگوار کی عظیم ذمہ داریوں کے نباہنے کی ہمّت دے اللہم اغفر لہ ونور ضریحہ واجزہ عنا وعن جمیع المسلمین خیر الجزاء وارفع درجتہ فی علیین وعوض المسلمین فیہ خیرا ———

سمیع

از حکیم الاسلام حضرت مولانا الحاج قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند

کلامی معجزہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیۡنَ اصۡطَفٰی

ہر ایک کلام کا مرتبہ اس کے متکلّم کے مرتبہ سے قائم ہوتا ہے۔ جس درجہ کا متکلم ہوگا، اسی درجہ کا اس کا کلام سمجھا جائے گا۔ اور اسی حد تک اس کی طرف ذہنوں اور عقلوں کی توجہ اور بقدر توجہ ہی اسکی عظمت واطاعت کے جذبات موجزن ہوں گے۔ مثل مشہور ہے کہ: "قدر الشہادت قدر الشہود۔ شہادت کا درجہ شاہدوں کے درجہ کی قدر ہوتا ہے۔"

غور کیا جائے تو متکلم کی حیثیت پانچ باتوں سے قائم ہوتی ہے۔ جو اس کے کلام میں اہمیت اور مقبولیت پیدا کرتی ہے۔ عقل و فہم۔ علم و خبر۔ منصب و مقام۔ صدق و صفا اور تاثیر و تصرف۔

عقل و فہم

اگر کوئی متکلم عقل ہی نہ رکھتا ہو یا کھو بیٹھا ہو۔ یا ناقص العقل ہو یا ناتمام عقل کا درجہ لئے ہوئے ہو تو اس کا کلام ناقابلِ التفات بلکہ قابلِ مضحکہ سمجھا جاتا ہے۔ مجنون کی باتوں پر سب ہنستے ہیں۔ کہ وہ مسلوب العقل ہے۔ جس سے اس کے کلام میں عاقلانہ انداز نہیں ہو سکتا کہ عقلمندوں کی توجہات کو کھینچ سکے۔ بچّوں کی طفلانہ باتوں کو پیار سے سنا تو جاتا ہے، مگر قابلِ التفات نہیں سمجھا جاتا۔ کہ ان میں مادۂ عقل گو موجود ہوتا ہے۔ مگر فی الحال ناتمام اور نارسیدہ ہوتا ہے۔ عورتوں کے کلام کو دلداری کے مد میں رد نہیں کیا جاتا۔ مگر مدارِ کار نہیں بنایا جاتا کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں۔ نوجوانوں کی باتوں کو سنتے ہیں۔ اور اس پر توجہ بھی دیتے ہیں بگر دستور العمل نہیں بناتے کہ عقل و فہم تو ان میں پورا ہوتا ہے۔ مگر اس میں پختگی اور گہرائی اور تجربہ کاری نہیں ہوتی جس سے وہ بالغ نظر کہلائیں۔ اور کلام میں مقبولیت پیدا ہو۔ لیکن بوڑھوں کے کلام کو کمال توجہ سے سن کر دستورِ زندگی بنا لیا جاتا ہے۔ خواہ وہ اہلِ علم میں سے نہ ہوں کہ ان کا تجربہ وسیع عقل تام اور فہم پختہ ہوتا ہے۔ وہ جس دائرہ کی بات کہتے ہیں جچی تلی کہتے ہیں۔ جس کے پیچھے ایک تاریخ اور پختہ کاری حجت ہوتی ہے۔ جس سے واضح ہے۔ کہ کلام کی مقبولیت اور گہرائی کا سب سے پہلا معیار عقل و فہم ہے۔

علم وخبر دوسرے معیار کے ماتحت جاہلوں کی بات پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ کہ اسے کسی معاملہ کی صحیح نوعیت کا اندازہ نہیں ہوتا جب کہ اس کے کلام میں علم کی روح دوڑی ہوئی نہیں ہوتی جو کلام میں وزن پیدا کرتی ہے۔ پھر کسی فن کے مبتدی کے کلام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی کہ وہ فن اور اس کے علم پہ حاوی نہیں ہوتا کہ اس کی بات فنی جامعیت لئے ہوئے ہو اور سنی جائے۔ اسی طرح ادھورے اور ادھ کچرے عالم کی علمی بات بھی ادھوری اور ناتمام ہوتی ہے۔ اس لئے علم وفضل والوں کے یہاں اس کی کوئی وقعت نہیں ہوتی جب کہ اس سے حقیقت واصلیت کا پورا پتہ نہیں لگتا۔ ہاں پورے عالم کی بات پہ ہر شخص توجہ کرتا ہے۔ اسے پلّہ باندھتا ہے، اور دنیا میں وہ بطور ضرب المثل کے زبان زد ہو جاتی ہے۔ کہ وہ کمال علم کے سبب پتہ کی بات ہوتی ہے۔ اور اصلیت کی نشاندہی کرتی ہے۔ نیز اس کے کلام میں جزئیت اور تنگی نہیں ہوتی جس سے صرف ایک بولا ہوا مسئلہ ہی حل ہو جائے۔ بلکہ وسعت علم کی قدر جامعیت کلیت اور بات کے تمام پہلوؤں کی رعایت ہوتی ہے۔ جس سے اس نوع کے تمام مسائل کا فیصلہ اسی ایک بات سے ہو جاتا ہے۔ جو درحقیقت جزوی صورت میں ایک جامع اصول ہوتی ہے۔ جس سے واضح ہے کہ کلام کے رتبہ کا سب سے بڑا معیار علم وخبر ہے۔

منصب ومقام تیسرے معیار کے ماتحت بات خواہ بذاتہ اہم بھی نہ ہو۔ لیکن منصب کی بلندی کے سبب قدرتاً بلند اور باحیثیت بن جاتی ہے۔ ایک ہی بات ایک عامی اور معمولی آدمی کہتا ہے تو ناقابل توجہ ہوتی ہے۔ اور وہی بات کسی قومی کونسل کا صدر یا کسی ملک کا سربراہ کہہ دے تو اس سے بساط سیاست الٹ جاتی ہے۔ معاملات کی دنیا میں انقلاب بپا ہو جاتا ہے۔ اور یہ فقرہ قوموں اور ملکوں کی توجہات کا مرکز بن جاتا ہے۔ جس پہ اہم اور دور رس نتائج مرتب ہونے لگتے ہیں۔ اس سے واضح ہے۔ کہ کلام کو پستی سے اٹھا کر رفعت وبلندی پہ پہنچا دینے کا ایک اہم معیار منصب ومقام بھی ہے۔

صدق وصفا ان ساری باتوں کے ساتھ کلام کی مقبولیت وتاثیر اور اس کے قابل التفات وتوجہ ہونے کے لئے متکلم کی سچائی غیر مشتبہ دیانت اور بے لاگ خلوص بھی لازمی ہے۔ جو کلام کی مقبولیت کا ایک زبردست معیار ہے۔ کلام کتنا ہی فاضلانہ ہو، لیکن کہنے والا خود غرض اور منافق ہے تو اس کا کلام کبھی بھی دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا اور کلام معمولی ہو مگر خلوص وصداقت کی روح لئے ہوئے ہو تو کبرا وسلاطین بھی اس کے سامنے جھک جاتے ہیں۔ جس سے واضح ہے کہ کلام کی مقبولیت وتاثیر کا اہم ترین معیار صدق وصفا بھی ہے۔

تاثیر وتصرف پھر کلام کے پرکھنے کا ایک بڑا معیار تاثیر وتصرف بھی ہے۔ جس کا تعلق اندرونی صفائی اور لطافت سے ہے۔ صاف باطن اور پاک ضمیر لوگوں کے کلام میں قدرتی تاثیر ہوتی

ہے۔ بے ضمیر انسان کی بات خواہ کتنی ہی فصیح و بلیغ ہو۔ شاعری سمجھی جاتی ہے۔ جس کا اثر قبول کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس میں کوئی وزن ہوتا ہے۔ اصولاً یہی پانچ معیار ہیں جن سے کلام کے وزن قبولیت اور اس کے محمود و مستحسن ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔

غور کیجئے کہ اگر کسی کے کلام میں یہ پانچوں معیار جمع ہوں، اور جمع ہی نہ ہوں، بلکہ انتہائی کمال کے ساتھ موجود ہوں، اور نہ صرف موجود ہی ہوں بلکہ لامحدود اور لامتناہی ہو کر پائے جاتے ہوں اور نہ صرف اتنا ہی ہو بلکہ وہ ذات ان کمالات کا سرچشمہ اور خزانہ بھی ہو کہ اس کے سوا کسی اور میں ذاتی طور پر پائے بھی نہ جاتے ہوں اور اگر کسی حد تک پائے بھی جاتے ہوں تو صرف اسی کے طفیل اور پر تو سے ظہور پذیر ہوتے ہوں تو اندازہ کیجئے کہ اس کا کلام کتنا بلند، کتنا جامع، کتنا موزوں اور کتنا مؤثر ہو گا۔ کہ اس کی بلندی، جامعیت، مقبولیت اور تاثیر و تصرف کی نہ کوئی حد ہو گی نہ نظیر۔

سو ظاہر ہے۔ کہ خدا کی ہستی سے بڑی کوئی ہستی ہو ہی نہیں سکتی کہ وہی منبع کمالات اور سرچشمۂ خیرات و مبرات ہے۔ پس جہاں تک عقل و فہم کے کمالات کا تعلق ہے۔ سو عقل و فہم اس سے ہے۔ وہ عقل و فہم سے نہیں۔ عقل و فہم کا کوئی مقام اس سے کٹ کر نہیں کہ وہی معیار عقل و خرد اور وہی عقل و خرد کا خالق ہے۔ اور عقل و فہم اسی کی پیدا کردہ مخلوق اور اپنی راہ پیمائی اور راہ نمائی میں اسی کی دریوزہ گر ہے۔

اوّل ما خلق اللہ العقل۔	سب سے پہلی چیز جو خدا نے پیدا کی وہ عقل ہے۔
ربنا الذی اعطٰی کل شیٔ خلقہ ثم ھدٰی۔	ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر شے کو اسکی خلقت (وجبلّت) عطا کی۔ پھر اسے (حواس و عقل و خرد اور علم و ہنر سے) راہ سمجھائی۔

جہاں تک علم و خبر کا تعلق ہے۔ سو وہی منشاء علم و خبر بھی ہے۔ اسی کا علم ہر شئے کو محیط دلوں کی ہر کھٹک پر حاوی اور ایک ایک ذرّہ پر چھایا ہوا۔

عالم الغیب والشھادۃ وھو الحکیم الخبیر	کھلے اور چھپے کا جاننے والا اور وہی ہے حکمت والا۔ اور وہ گھیرے ہوئے ہر چیز کو اپنے علم سے۔
واحاط بکل شیٔ علما	اور اسکا علم ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔
وھو علیمٌ بذات الصدور	وہی جاننے والا ہے سینوں کی کھٹک کا۔
یعلم ما بین ایدیھم وما خلفھم	جانتا ہے۔ جو انکے سامنے ہے اور جو انکے پیچھے ہے۔ جانتا ہے اسے جو زمین کے (اندر) ہے اور جو

یعلم مایلج فی الارض وما یخرج منھا — اس سے باہر نکلتا ہے۔ اور جو آسمان سے

وماینزل من السماء وما یعرج فیھا — اترتا ہے جیسے پانی اور جو اس میں چڑھتا ہے

(جیسے بندوں کے نیک اعمال وغیرہ)

پھر جہاں تک منصب و مقام کا تعلق ہے سو الوہیت سے آگے کون سا مقام ہے جس کی کوئی بود و نمود ہو۔؟ پس وہی سررشتۂ منصب و مقام ہے۔ کہ وہ الٰہ و معبود ہے۔ اور معبودیت سے آگے کوئی مقام نہیں، وہی سرمخزن قدرت و اقتدار ہے کہ جہانوں میں اسی کی بادشاہی ہے۔ اسی کا نام چلتا ہے۔ اور اسی کا کام جاری ہے۔ اسی کے کلمہ سے جہاں بنتے اور بگڑتے ہیں۔

انی انا اللہ لا الٰہ الا انا۔ — میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔

وھو علی کل شیٔ قدیر۔ — اور وہی ہے ہر چیز پر قادر۔

لہٗ ملک السمٰوٰت والارض۔ — اسی کی ملک ہیں سارے آسمان اور زمین۔

ملک الناس۔ الٰہ الناس۔ — بادشاہ ہے لوگوں کا معبود لوگوں کا۔

عند ملیک مقتدر۔ — (متقی لوگ ہوں گے باغوں میں اور نہروں میں) پاس وسیع الملک والے بادشاہ کے۔

وللہ الاسماء الحسنٰی فادعوہ بھا — اور اللہ ہی کے ہیں پیارے نام سو انہی سے

فعّال لما یرید۔ — اسے پکارو، کر ڈالنے والا ہے جو بھی ارادہ فرمائے۔

اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون۔ — جب کسی شے (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کرتا ہے تو فرمادیتا ہے ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔

بہرحال ہر پاک منصب و مقام اسی کا ہے۔

پھر جہاں تک صدق و مقال اور صفائی معاملہ کا تعلق ہے۔ تو وہی ذات بابرکات ساری سچائیوں اور صداقتوں کا مخزن بھی ہے۔ کہ سچائیوں کو تولنے والا اور کھولنے والا اس سے زیادہ کون ہے۔؟ سچائی سچائی ہی اس سے ہوتی ہے۔ کہ جو کچھ وہ فرمادے وہی سچائی ہے۔ اور جو کچھ وہ کہہ دے وہی حق و صداقت ہے۔

قولہ الحق ولہ الملک۔ — قول سچا ہے تو اس کا اور ملک ہے تو اس کا۔

ومن اصدق من اللہ قیلا۔ — اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچے قول والا؟

ومن اصدق من اللہ حدیثا۔ — اور کون ہے اللہ سے زیادہ سچی بات والا۔

اور اس لئے وہی تاثیر و تصرف کا بھی حقیقی سرچشمہ ہے۔ اور اسی کا ہر کلمہ و کلام عین تاثیر و تصرف ہے کہ اس سے

زیادہ پاک باطن لطیف وستھرا اور بے لوث کون ہوسکتا ہے۔؟ اس لئے اس کا ایک ایک حرف تاثیر وتصرف کا سرچشمہ ہے۔ جس سے پتھروں کے کلیجے بھی شق ہوجائیں، اور انسان تو انسان متمرد انسان بھی رام ہوجائیں، اگر حقیقتاً سن لیں۔

لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرأیتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ۔

اگر ہم اتار دیتے اس قرآن کو کسی پہاڑ پر تو دیکھتا کہ وہ لرز جاتا اللہ کے ڈر سے۔

انا سمعنا قرانا عجبا یھدی الی الرشد فامنا بہ۔

(جنات نے کہا) ہم نے ایسا عجیب پڑھنا سنا جو بزرگی کی راہ دکھلاتا ہے۔ سو ہم اس پر ایمان لے آئے۔

اور ظاہر ہے کہ جب خدائے متکلم کلامی کمالات کے سارے ہی معیاروں عقل وخرد، علم وخبر، منصب ومقام صدق وصفا اور تاثیر وتصرف کا سرچشمہ ہے۔ تو کلام خداوندی سے بڑھ کر کسی کا کلام نہیں ہوسکتا۔ پس نہ اس سے بڑھ کر کسی کلام میں عقل وخرد اور دانائی ہوسکتی ہے۔ نہ اس سے زیادہ کسی کے کلام میں علم وخبر کے ذخیرے ہوسکتے ہیں۔ نہ اس سے بڑھ کر کسی کے کلام میں منصب ومقام کی بلندیاں پائی جاسکتی ہیں۔ نہ اس سے زیادہ کسی کے کلام میں صدق وصفا اور حق وصداقت ہوسکتی ہے۔ اور نہ اس سے زیادہ کسی کے کلام میں تاثیر وتصرف ممکن ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ ایسا ہی کلام ہر حال کے مقتضا کے مطابق اور ہر قسم کی پیچیدگی اور چیستانیت سے پاک مبرّا اور منزّہ بھی ہوسکتا ہے۔ اور وہی انتہائی سلاست انتہائی فصاحت وبلاغت اور انتہائی شیرینی وحلاوت کا مجموعہ بھی ہوسکتا ہے۔ تو وہ کلام جو ان ساری کلامی خوبیوں کا مجموعہ ہونے کے سبب بے مثل ومثال اور ناممکن النظیر ہے، وہی قرآن حکیم ہے۔ جو حکمت والے خدا کا کلام ہے۔ اسی کا اتارا ہوا بول ہے۔ اس کا پڑھا ہوا قرآن ہے۔ اور اسی کی اندرونی صفات کمال کا پاک مظہر ہے۔ جس میں اسکی پاکیاں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور اسکی خوبیاں چمکتی ہوئی صاف دکھائی دیتی ہیں۔

پس قرآن کو پڑھو تو یہ پانچوں ہی معیار اس میں منہ سے بولتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ محض نقل وخبر یا احکام ہی کا مجموعہ نہیں بلکہ عقل وحکمت اور فرزانگیوں کا بہتا ہوا سمندر بھی ہے۔ اس کا کوئی حکم نہیں جس میں حکمت نہ ہو۔ کوئی نقل نہیں جس میں عقل نہ ہو اور کوئی ہدایت نہیں جس میں فلسفہ نہ ہو۔ اسی لئے اس میں تدبّر اور تفکر کا امر کیا گیا ہے۔ کہ بغیر غور وفکر کے اس کی عقلی حقائق واشگاف نہیں ہوسکتیں۔ اور عقلی حقائق اس میں تھیں تو غور وفکر کا حکم بھی دیا گیا۔ اس لئے وہ کلام ہی نہیں، حکمت بھی ہے۔ جو عقل وخرد کا نچوڑ ہے ــــ

ذلك مما أوحى اليك ربك من الحكمة۔ — یہ قرآن ان حکمت کی باتوں میں سے ہے جسکی ہم نے اے پیغمبر تمہاری طرف وحی کی ہے۔

كتاب انزلناه اليك مبارك ليدبروا آياته وليتذكر اولوا الالباب۔ — کتاب برکت والی جسے ہم نے تمہاری طرف اے پیغمبر اتارا تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں تدبر سے کام لیں۔ اور عقل والے اس سے (بھولا ہوا سبق) یاد کرلیں۔

ان في ذلك لآيات لاولي النهى۔ — (بلاشبہ قرآن کی ان تعلیموں میں) البتہ بڑی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے۔

ان في ذلك لآيات لقوم يعقلون۔ — ان میں نشانیاں ہیں عقل والی قوم کے لئے۔

وما يذكر الا اولوا الالباب۔ — اس (قرآن) سے وہی نصیحت پکڑ سکتے ہیں جو گہری عقل والے ہیں۔

پھر اس قرآن کے علم وخبر کا یہ عالم ہے کہ زندگی اور موت کا کوئی شعبہ نہیں جس کے بارے میں فطری ہدایتوں کے بیشمار ذخیرے اس میں موجود نہ ہوں۔ اور علم جامع پہ مشتمل اخبار واحکام نہ بتائے گئے ہوں۔

تبيانا لكل شئ وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين۔ — (یہ قرآن) کھلا ہوا مدلل بیان ہے ہر شے کے لئے اور ہدایت ورحمت اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے۔

وهو الذي انزل اليكم الكتاب مفصلا۔ — وہ (اللہ) وہ ہے جس نے تمہاری طرف یہ مفصل کتاب (قرآن) نازل کی۔

پھر یہی قرآن سارے ہی مناصب ومقامات رفیعہ والے خالق ومالک اور ملیک مقتدر کا کلام ہے۔ تو اس کی رفعت وبلندی اور بلحاظ منصب ومقام عظمت بھی انتہائی ہے۔ اور اس کی یہ دلیل کافی ہے کہ وہ اس رفیع المنزلت کا نازل کردہ کلام ہے۔

تنزيلا ممن خلق الارض والسموات العلى۔ — (یہ قرآن) نازل کردہ ہے۔ اس کی طرف سے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا۔

تنزيل الكتاب من الله العزيز الحكيم — (یہ قرآن) نازل کردہ ہے اللہ عزت والے حکمت والے کی طرف سے۔

وانه لتنزيل رب العالمين۔ — اور (یہ قرآن) نازل کردہ ہے جہان کے پالنہار کی طرف سے۔

تبارك الذی نزل الفرقان علی عبدہٖ لیکون للعلمین نذیرا الذی لہ ملك السمٰوٰت والارض۔

برکت والی ہے وہ ذات جس نے فرقان (قرآن) اپنے بندے پر اتارا تاکہ وہ (پاک بندہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جہانوں کے ڈرانے والا ہو اور جس کی ملک ہے ملک آسمانوں اور زمین کا۔

اور اسی لئے اُسے عظیم کہا گیا ——

ولقد اٰتینٰك سبعًا من المثانی والقرآن العظیم۔

اور ہم نے تمہیں عطا کی ہے بار بار پڑھنے والی سات آیتیں اور قرآن جو عظمت اور بڑھائی والا ہے۔

جس سے واضح ہے کہ یہ کتاب مبین سارے ہی مناصب جلیلہ کے آثار سے مملو اور بھرپور ہے۔

—— پھر یہ قرآن چونکہ انتہائی سچے کا کلام ہے۔ اس لئے یہ کلام بھی بے انتہا سچا حق و صداقت میں بے نظیر اور صدق و صفا میں بے مثال ہے۔

یعلمون انہ منزل من ربك بالحق

جانتے ہیں کہ یہ (قرآن) اتارا گیا ہے تیرے رب کی طرف سے سچائی کے ساتھ۔

انّا انزلنا الیك الکتاب بالحق۔

ہم نے تم پر نازل کی کتاب حق و صداقت کیساتھ۔

وبالحق انزلنا وبالحق نزل۔

اور حق (و صداقت) سے ہم نے اسے اتارا اور حق و صدق ہی سے وہ اترا۔

نزل علیك الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ۔

اتاری تم پر کتاب (قرآن) حق کے ساتھ جو تصدیق کرنیوالی ہے۔ تمہارے سامنے (والی سچائیوں کی)

بل جاء بالحق وصدق المرسلین۔

بلکہ یہ (قرآن) حق کے ساتھ آیا اور اس نے (پچھلے سب) رسولوں کی تصدیق کی۔

عبدیت و اطاعتِ خداوندی کا مظاہرہ

از ارشادات حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

(خطبۂ جمعۃ المبارک ۲۸ شعبان ۱۳۸۲ھ)

ضبط و ترتیب ادارہ الحق

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رض قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ وَمَنْ قَامَ رَمَضَانَ اِیْمَانًا وَّاِحْتِسَابًا غُفِرَ لَهٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ

رمضان کی فضیلت

اس وقت یہ حدیث مبارک جو میں نے آپ کے سامنے بیان کی۔ اس میں حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسلام کے تیسرے رکن کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ سر پہ آگیا ہے۔ جو ہمارے لئے بہت بڑا ذریعۂ مغفرت و کامیابی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ جس مرد و عورت نے ماہِ رمضان میں روزے صرف ایمان کی وجہ سے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ بخش دئے جائیں گے۔ یعنی اس کا روزے رکھنا صرف ایمان اور ثوابِ خداوندی کی امید کی وجہ سے ہو۔ کوئی دوسری غرض لالچ و حکمت ملحوظ نہ ہو گو شریعت کے ہر حکم اور ہر بات میں ہزارہا نکتے اور بیشمار حکمتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر ایک بندۂ مومن کا کام یہ نہیں کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کیلئے مصلحتوں کے درپے ہو۔ حکمت اور فائدہ معلوم ہو یا نہ ہو مگر بندہ کا کام تعمیلِ حکم ہے۔

روزہ اور دوسرے احکام میں تعمیلِ حکمِ خداوندی

اگر سمندر میں کودنے کا حکم ہو۔ تو غلام کا کام فوراً کود جانا ہے۔ اور اگر آگ میں چھلانگ لگانے کا حکم ہو جائے۔ تو بلا چوں و چرا کود جانا اطاعت اور فرمانبرداری کی دلیل ہے۔ یہی غلام کا کام ہے، کہ بلا کسی پس و پیش آقا کے احکام کی تعمیل کرے۔ محمود غزنویؒ ایک بہت بڑے بادشاہ گذرے ہیں۔ فاتح ہند تھے، غزنی سے لیکر ہندوستان کے دوسرے سرے تک

سلطنت پھیلی ہوئی تھی، اس کے ساتھ ولی اللہ بھی تھے، جبکہ بادشاہوں میں اولیاء بہت کم ملتے ہیں۔ اتنی عظمت و شان کی بادشاہی تھی۔ ان کا ایک غلام تھا، جو ایاز کے نام سے مشہور ہے۔ ایاز سے حضرت محمود غزنویؒ کو بے پناہ محبت تھی۔ محمود و ایاز کے واقعات مشہور ہیں۔ ایاز کے ساتھ بادشاہ کی غیر معمولی محبت سے لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ موقعہ بموقعہ وزراء مقربین نے بادشاہ سے اس کی وجہ دریافت کی۔ کہ ہم بڑے بڑے عہدہ دار ہیں۔ اور سلطنت کے اہم امور انجام دینے کے باوجود جتنی محبت آپ کی ایاز کے ساتھ ہے، اتنی ہمارے ساتھ نہیں، بادشاہ سُن کر خاموش ہو جاتے ——— ایک دن بادشاہ بھرے دربار میں موجود تھے۔ آس پاس بڑے بڑے اہل حکومت و عمائدین بھی موجود تھے۔ اچانک بادشاہ نے ہیروں اور موتیوں سے مرصع جواہروں سے بھرا ہوا گلاس اٹھا کر وزیر اعظم کو حکم دیا۔ کہ اسے توڑ دو۔ وزیر اعظم حیران و ششدر رہ گیا۔ کہ لاکھوں کا یہ قیمتی بلوری گلاس کس طرح توڑ دوں اور کیوں بادشاہ نے ایسا حکم دیا؟ سوچ میں پڑ گیا۔ کہ بادشاہ کے دماغ میں فتور تو نہیں آیا۔؟ بادشاہ نے وزیر کے تامل کو دیکھ کر گلاس اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور دوسرے وزیر کو دیا۔ وہ بھی پس و پیش کرنے لگا۔ اب بادشاہ نے پورے غصّہ میں اس سے بھی لے کر تیسرے وزیر اور درباری کو دیا، اس نے بھی حیرانی اور لیت و لعل کے ساتھ تعمیل حکم میں کوتاہی کی۔ اسی طرح سب مصاحبوں اور کمانڈروں نے پس و پیش کیا۔ اب سلطان محمود غزنوی نے گلاس ایاز کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور اسے توڑنے کا حکم دیا۔ ایاز نے حکم سنتے ہی ایک پتھر نیچے اور ایک پتھر اوپر رکھ کر گلاس کو توڑ ڈالا۔ بلوری برتن کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ موتی جواہر توڑ ڈالے۔ اب اچانک بادشاہ نے غصّہ سے چلّا کر کہا کیوں ایاز تیرا دماغ خراب ہے۔ کہ تو نے لاکھوں روپے کا برتن ضائع کر دیا۔ کیوں یہ بے وقوفی کی۔ گلاس کو بلاوجہ توڑ دیا۔ ایاز نے فوراً دونوں ہاتھ جوڑ کر بادشاہ سے معافی مانگنی شروع کی۔ عاجزی اور شرمندگی کا اظہار کیا۔ کہ حضور میں تو ایک غلام ہوں۔ مجھ سے غلطی اپنی کم عقلی کی وجہ سے سرزد ہوئی۔ میں کم عقل ہوں۔ بے سمجھ اور بے وقوف ہوں۔ حضور مجھے فروخت کر ڈالیے۔ اور میری قیمت سے گلاس کا تاوان پورا کیجئے۔ اور جو سزا و جرمانہ مجھ پر ہو سکے لگا دیجئے۔ محمود غزنوی ایاز کا یہ حال دیکھ کر درباریوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اور کہا۔ کہ دیکھئے ایاز اور تم میں یہ فرق ہے۔ اسکی اطاعت و فرمانبرداری کی شان یہ ہے۔ کہ تم نے میرے حکم کی تعمیل میں عقل مندی اور سوچ و فکر سے کام لینا شروع کیا۔ اور ایاز کے ساتھ بھی عقل و فکر تھا۔ مگر میرے حکم کی تعمیل کے بارے میں نہ اس نے عقل و فکر

کو دخل دیا۔ اور نہ مال کے ضائع ہونے و برباد ہونے کی فکر کی۔ پھر میں نے باوجود اس کے کہ تم سب کے سامنے اسے حکم دیا تھا۔ مگر جب میں نے اسے ڈانٹا اور بازپرس کی تو اس نے یہ نہیں کہا۔ کہ آپ ہی کا حکم اس کے توڑنے کا منشاء وسبب بنا ہے۔ بلکہ رو کر معافی مانگی۔ لجاجت اور معذرت کی۔ گڑگڑا کر معافی مانگی۔ یہ ہے فرمانبرداری اور بے پناہ اطاعت جس کی وجہ سے ایاز نے مجھے گردیدہ بنالیا ہے ـــــ میرے بھائیو! ایاز نے ہمیں ایک عجیب سبق دیا ہے۔ کہ ایک فرمانبردار غلام اپنے آقا کی اطاعت کسطرح کرتا ہے۔ ایک غلام تعمیلِ حکم کی حکمتوں کا خیال نہیں کرتا۔ ہمیں تو تسلیم کا مظاہرہ کرنا چاہیئے۔ اور اپنی ہر مرضی اور خواہش کو آقا کی مرضی پر قربان کرنا چاہیئے۔ ع

کار عاشق خون خود بہ پائے جانان ریختن

بلاچون وچرا انقیاد وعبادت کا دوسرا نمونہ

ہمارے جدّ امجد حضرت آدم علیٰ نبیّنا علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اللہ جل جلالہٗ نے اپنے دستِ قدرت سے پیدا فرمایا۔ ابلیس نے اس سے قبل سات لاکھ برس اللہ کی عبادت کی۔ بڑی علم و دانش کا مالک اور بہت بڑی عبادتیں کرنے والا تھا۔ اب خداوند تعالیٰ کی طرف سے حضرت آدمؑ وابلیس پر امتحان ہوتا ہے۔ جو عبادت تعمیل ہی سے اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں ہر طرح کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے، ہر طرف چلنے پھرنے کی اجازت دی مگر ایک درخت کے نزدیک ہونے سے منع کیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے تقدیر وفیصلہ خداوندی کے مطابق وہ میوہ کھایا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔ کہ قانون و اسباب کے ماتحت انہیں جنت سے نکالا جائے۔ کہ ہر کام کے لئے اللہ تعالیٰ نے اسباب ومسبّبات کا سلسلہ چلایا ہے۔ تو بہر حال خدا کیطرف سے حکم ہوا۔ جنت سے باہر ہو کر زمین میں اترنے کا ـــــ اور بازپرس کی گئی۔ کہ کیوں اس درخت کو کھایا۔ آدم علیہ السلام کے پاس جواب کیلئے معقول وجوہات تھے۔ اگر مناظرہ کرتے تو کہہ سکتے تھے۔ کہ یارب یہ تو تقدیر کا معاملہ تھا۔ اور میری پیدائش سے قبل میرے مقدر میں یہی فیصلہ ہو چکا تھا۔ اور چونکہ زمین میں میری خلافت مقدراتِ الٰہیہ میں سے تھی۔ اس لئے میں نے اس درخت کا میوہ کھایا۔ اور میرا یہ اقدام تیری ہی منشاء و ارادہ کی تعمیل تھی۔ اور بھی کئی باتیں عرض کر سکتے تھے۔ مگر نہیں حضرت آدمؑ اپنے رب کے حضور گڑگڑانے لگے اور قصور وعجز کا اقرار کیا۔ اور رو رو کر اپنے رب سے التجا کی۔

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ ○

ترجمہ: اے رب ہم نے اپنے نفس پر زیادتی کی۔ ظلم کیا مجھ سے غلطی ہوئی اب اگر تو ہمیں نہ بخشے اور تیری رحمت وکرم نہ ہو۔ تو ہم ہلاک و برباد ہو جائیں گے۔ (تیری ہی رحمت کا سہارا مانگتے ہیں۔ اور تیری ہی پناہ میں آتے ہیں۔)

بیہ نہ فرمایا کہ قسمت ہی میں ایسا ہوا تھا۔ کہ میری پیدائش سے پانچ ہزار سال قبل لوحِ محفوظ پہ ایسا لکھا تھا۔ تو وہ تو ہونا ہی تھا۔ بلکہ بارگاہ خداوندی میں عجز وخطا کا اظہار کیا۔ رحمتِ خداوندی جوش میں آئی۔ اور اس بحرِ بیکراں نے حضرت آدمؑ کو اپنی آغوشِ رحمت میں جگہ دی۔

اطاعتِ خداوندی میں عقل بگھارنا ابلیس کا وطیرہ ہے

دوسری طرف عقلمند اور عالم کہلانے والا ابلیس ہے۔ اس کا امتحان یہ تھا۔ کہ خدا نے اسے حکم دیا۔ کہ آدمؑ کی سمت سجدہ کرو۔ جس طرح ہم خدا کو سجدہ کرتے وقت اپنا رخ خانہ کعبہ کی طرف رکھتے ہیں۔ اسی طرح خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہوا۔ تمام ملائکہ اور ابلیس سجدہ کرتے وقت اپنا رُخ آدمؑ کی طرف کریں۔ سب ملائکہ نے فوراً تعمیل کی۔ مگر ابلیس نے سجدہ سے انکار کیا۔ اور سیدھا کھڑا رہا۔ خدا نے پوچھا اے ابلیس تو نے کیوں میرے حکم سے سرتابی کی اور کھڑے رہے۔ اب اگر ابلیس اعترافِ عجز و قصور کرتا تو اچھا تھا۔ مگر اس نے عقل بگھارنا شروع کی۔ جسطرح آج کل دین کے ہر حکم کو عقل کی اندھی عینک سے دیکھا جاتا ہے ـــ تو ابلیس نے کہا، کہ آپ کا یہ حکم خلافِ عقل ہے۔ کہ مجھے تو آگ سے پیدا کیا گیا اور آدم کو مٹی سے۔ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ۔ الآیۃ
اب جبکہ میں خلقت کے لحاظ سے آدمؑ سے افضل ہوں تو اسے سجدہ کس طرح کروں۔ اب کیا ہوا۔ لاکھوں سال کی عبادت برباد ہوئی۔ اور ابد الآباد تک ملعون و معتوب ہوا۔ خدا کا مبغوض بن کر رہا ـــ بھائیو! خدا کی بارگاہ میں رونے اور عاجزی و تواضع، درماندگی اور عبدیت کی جتنی قدر ہے۔ وہ اور کسی چیز کی نہیں۔ ایک معمولی فوجی افسر کے احکام کی تعمیل بلا چوں وچرا کی جاتی ہے۔ فوج بلا کسی پس و پیش احکامات کو مانتی چلی جاتی ہے۔ اور اسے یہ مجال نہیں کہ یہ پوچھے کہ ہم کس طرف کوچ کر رہے ہیں۔ فلاں حملہ اور لڑائی ہمیں کیوں کرنی ہے۔ ہمارا سفر سمندر سے ہوگا یا جہاز سے۔ ایسی باتیں پوچھنے والے کو شوٹ کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ دین کی ہر بات اور ہر حکم خداوندی میں نکتے اور حکمتیں ڈھونڈتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے۔ کہ رمضان المبارک کے روزوں میں بھی خداوند تعالیٰ نے ہزاروں روحانی و جسمانی حکمتیں اور فوائد رکھے ہیں، جن میں سے بعض کو خود حق تعالیٰ نے بیان بھی فرمایا ہے۔ اور نبی کریم علیہ السلام اور ان کے بعد ہر زمانے کے اولیاء و عارفین نے اس کی تشریح بھی کی ہے۔ مگر سب سے بڑی حکمت اور نکتے کی بات وہی ہے۔ جسے حضور علیہ السلام نے اس حدیث میں ایماناً و احتساباً کے دو لفظوں میں اشارہ فرمایا۔ کہ ہمارا روزہ صرف اور صرف ایمانی تقاضے اور یقین و اعتقاد کی وجہ سے اظہارِ عبدیت کیلئے ہونا چاہیئے۔ اور خداوند تعالیٰ کے حکم

کی تعمیل اور اس کا اجر و ثواب ملحوظ ہونا چاہیئے۔

تعمیلِ ارشادِ ربّانی اور رحمتِ خداوندی پر یقین کے دو نمونے

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن جہنّم میں دو شخص بہت شور مچائیں گے۔ ان کی چیخ و پکار بہت زیادہ ہوگی — خداوند تعالیٰ ان کے نکالنے کا حکم دے کر ان سے پوچھیں گے۔ کہ تم نے اتنا شور ہنگامہ کیوں مچا رکھا ہے۔ اور بھی تو جہنم میں لوگ موجود ہیں۔ وہ کہیں گے کہ اے اللہ ایک تو اس وجہ سے کہ تو ہمیں بخش دے، اور تکلیف بھی تو شدید ہے۔ اس لئے ہم چیختے چلاتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کیطرف سے پھر حکم ہوگا۔ کہ جاؤ جہنم میں داخل ہو جاؤ۔ ان میں سے ایک فوراً جاکر جہنم میں چھلانگ لگا دے گا۔ اور دوسرا جہنم کے کنارے ٹال مٹول اور لیت و لعل کرے گا۔ اور مڑ مڑ کر پیچھے دیکھے گا۔ کہ تو نے پھر کیوں آگ میں چھلانگ لگا دی۔ وہ کہے گا۔ اے رب تیرا حکم تھا۔ اس لئے میں سرتابی نہ کر سکا۔ اللہ جل جلالہٗ فرماویں گے۔ کہ ہاں بس اسی طرح تابعداری میری دنیا میں بھی کرنی چاہیئے تھی۔ اب دوسرا شخص لیت و لعل کرنے والا کہے گا۔ کہ اللہ تو رحیم و غفور ہے۔ اور مجھے تیری رحمت پر یقین تھا۔ کہ ایک دفعہ جب نکال دیا ہے۔ تو دوبارہ جہنم میں داخل نہیں کرے گا۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہوگا۔ کہ تعمیلِ حکم بھی ایسے ہی ہونی چاہیئے۔ اور رحمت پر یقین بھی ایسا ہی چاہیئے۔

روزے کا مقصد اور برکات

ہمارے روزے کا مقصد محض ایمان و ثواب کی امید ہونی چاہیئے۔ کہ خداوند تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہ ہمیں اسے بجا لانا ہے۔ جس نے اس ایمان اور یقین اور امید مغفرت سے روزے رکھے۔ غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔ اس کے پچھلے سال کے تمام گناہ بخش دئے جائیں گے — حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے۔ کہ بدبخت ہے وہ شخص جس پر رمضان کا مہینہ گذرا۔ اور اس نے اپنی بخشش نہ کروائی۔ ہمارے صوبہ سرحد میں پہلے رمضان کا احترام رکھا جاتا تھا۔ اب دوسرے علاقوں کیطرح یہاں بھی رمضان کا احترام اور اسکی منزلت دلوں سے نکلتی جا رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کے زوال کی علامت ہے۔ اور پھر ایسے موسم اور سردیوں میں بھی روزے نہ رکھنا بہت بڑی بدبختی ہے۔ حضورؐ نے ایسے موسم میں روزوں کو "غنیمتِ باردہ" سے تشبیہ دی ہے۔ یعنی ٹھنڈی غنیمت جو بلا کسی تکلیف کے ہاتھ آ سکے — اس غنیمتِ باردہ سے فائدہ اٹھائیں۔ رحمتِ خداوندی جوش میں ہے —

احکام و مسائل رمضان المبارک

و

صدقۃ الفطر

روزے میں نیّت کی ضرورت کا بیان

روزے میں نیّت شرط ہے۔ (نیّت کے معنے دل کے ارادے کے ہیں۔) اگر روزے کا ارادہ نہیں کیا اور تمام دن کچھ کھایا پیا نہیں تو روزہ ادا نہ ہوگا۔ رمضان کے روزہ کی نیّت آدھے دن شرعی تک کر سکتا ہے۔ یعنی تقریباً ساڑھے گیارہ بجے تک اس کے بعد اگر نیت کریگا۔ تو معتبر نہ ہوگی۔ زبان سے نیت کرنا فرض نہیں۔ لیکن بہتر اور مستحب ہے کہ سحر کا کھانا کھا کر اسطرح نیّت کر لیا کرے۔ بِصَوْمِ غَدٍ نَوَیْتُ مِنْ شَهْرِ رَمَضَانَ۔ اگر افطار کے وقت ہی نیّت کرے تب بھی جائز ہے۔ بعض لوگ جو یہ سمجھتے ہیں۔ کہ نیّت کے بعد کھانا پینا جائز نہیں یہ خیال بالکل غلط ہے۔ بلکہ صبح صادق ہونے سے پہلے کھانا پینا وغیرہ بلا شبہ درست ہے۔ نیّت کی ہو یا نہ کی ہو۔

اُن باتوں کا بیان جن سے روزہ نہیں جاتا

بھول کر کھانا پینا روزہ کو نہیں توڑتا۔ بلا اختیار حلق میں گرد و غبار یا مکھی مچھر چلے جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ آٹا پیسنے والے اور تمباکو کوٹنے والے کے حلق میں جو آٹا وغیرہ اُڑ کر جاتا ہے، اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ کان میں پانی چلا جاوے یا خود بخود قے آوے یا خواب میں غسل کی حاجت ہو جاوے یا قے اگر خود بخود لوٹ جاوے ان سب باتوں سے روزہ نہیں جاتا اور کچھ خلل نہیں آتا۔ آنکھ میں دوا ڈالنے سے روزہ نہیں جاتا۔ خوشبو سونگھنے سے کچھ خلل نہیں آتا۔ بلغم نگل جانے سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔ اگر قصداً قے کی مگر تھوڑی سی (یعنی مُنہ بھر سے کم) تو روزہ نہیں جاتا۔ تھوڑی سی قے آئی اور قصداً لوٹا کر نگل گیا تو اس میں اختلاف ہے۔ اگر کوئی روزہ میں بھول کر کچھ کھا پی رہا ہے۔ اور قوی و تندرست ہے۔ تو اس کو یاد دلا دینا جائز ہے۔ اگر ضعیف و ناتوان ہے تو نہ یاد دلانا درست ہے۔ اگر خود بخود مسواک وغیرہ کرنے سے دانتوں سے خون نکلے۔ لیکن حلق میں نہ جائے۔ تو

روزہ میں خلل نہیں آتا۔ اگر خواب میں یا صحبت کرنے سے رات کو غسل کی حاجت ہوئی اور صبح صادق ہونے سے پہلے غسل نہیں کیا تو روزہ میں خلل نہیں آتا۔ اگر دن کو سوتے ہوئے غسل کی حاجت ہوگئی تو روزہ میں ذرا بھی نقصان نہیں آتا۔

جن باتوں سے قضا واجب ہوتی ہے

کان میں یا ناک میں دوا ڈالنا۔ قصداً منہ بھر قے کرنا۔ منہ بھر قے آئی تھی اس کو نگل جانا۔ کلّی کرتے ہوئے حلق میں پانی چلا جانا۔ یہ سب چیزیں روزہ کو توڑنے والی ہیں۔ مگر صرف قضا آئے گی کفّارہ واجب نہیں۔ کنکر یا لوہے تانبے وغیرہ کو نگل جائے تو روزہ ٹوٹ جائے گا۔ اور صرف قضا واجب ہوگی کفّارہ نہیں۔ رات سمجھ کہ صبح صادق کے بعد سحری کھالی۔ تو اس روزہ کی قضا واجب ہوگی۔ دن باقی تھا غلطی سے سمجھ کر کہ آفتاب غروب ہوگیا روزہ کھول لیا تو صرف قضا واجب ہوگی کفّارہ نہیں۔ جان بھولکر بدون بھولنے کے صحبت کرنا۔ کھانا پینا روزہ کو توڑتا ہے۔ اور قضا بھی آتی ہے، اور کفّارہ بھی۔ کفّارہ یہ ہے کہ ایک غلام آزاد کیا جائے۔ اس کی طاقت نہ ہو تو متواتر ساٹھ روزے رکھنا۔ اسکی بھی طاقت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت کھانا کھلانا۔

جن چیزوں سے روزہ مکروہ ہوتا ہے اور جن سے مکروہ نہیں ہوتا

بلا ضرورت کسی شے کو چبانا یا نمک وغیرہ کا ذائقہ دیکھ کر تھوک دینا مکروہ ہے۔ قصداً منہ میں تھوک اکٹھا کر کے نگل جانا مکروہ ہے۔ غیبت، بدگوئی، لڑائی، جھگڑا روزہ کو مکروہ کر دیتے ہیں۔ اور ثواب بہت کم رہ جاتا ہے۔ مسواک کرنا۔ سر پر یا مونچھوں پر تیل لگانا مکروہ نہیں۔ آنکھ میں دوا ڈالنا مکروہ نہیں۔ سُرمہ لگانے سے یا سُرمہ لگا کر سو جانے سے روزہ میں کچھ خلل نہیں آتا۔ ناواقف لوگ جو مکروہ سمجھتے ہیں۔ بالکل غلط ہے۔ خوشبو سونگھنا مکروہ نہیں۔ اگر بی بی کو اپنے خاوند، نوکر کو اپنے آقا کے غصہ کا اندیشہ ہو تو کھانے کا نمک چکھ کر تھوک دینا مکروہ نہیں۔

روزہ نہ رکھنے کی اجازت کا بیان

اگر مرض کی وجہ سے روزہ رکھنے کی طاقت نہ ہو تو رمضان میں روزہ نہ رکھے۔ تندرستی کے وقت قضا کرے۔ اگر روزہ رکھنے کی وجہ سے مرض کے زیادہ ہوجانے کا خوف ہے تب بھی روزہ چھوڑ دینا جائز ہے، پھر قضا رکھے۔ حاملہ کو اگر بچے یا اپنی جان کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو تو روزہ چھوڑ دینا اور پھر قضا کر لینا جائز ہے۔ اپنے یا غیر کے بچے کو دودھ پلاتی ہو اور روزہ رکھنے کیوجہ

سے عذر ہو تو قضا کر لینا جائز ہے۔ ہمارے نواح کے چھتیس[۳۶] کوس یعنی انگریزی اڑتالیس[۴۸] میل کا سفر ہو یا اس سے زیادہ ہو وہ سفر شرعی کہلاتا ہے۔ یعنی ایسے سفر میں مسافر کو اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے، واپس آنے کے بعد قضا کرے۔ اگر کوئی مسافر دوپہر سے پہلے اپنے وطن میں پہنچ گیا۔ اور اب تک کچھ کھایا پیا نہیں تو اس پر واجب ہے کہ روزہ پورا کرے۔ کیونکہ اب سفر کا عذر باقی نہیں رہا اگر کوئی شخص کسی تیز سواری یا ریل میں دو تین گھنٹہ میں اڑتالیس میل پہنچ جائے گا۔ اس کے لئے بھی سفر کی رخصت یعنی نماز کا قصر اور افطار کی اجازت حاصل ہو جائے گی۔ بہت بوڑھا ضعیف جس کو روزہ میں نہایت شدید تکلیف ہوتی ہے۔ روزہ نہ رکھے اور ہر روزہ کے بدلے پونے دو سیر گندم (بوزن انگریزی) مسکین کو دے لیکن اگر پھر کبھی طاقت آجائے گی تو قضا رکھنی ضروری ہوگی۔ عورت کو اپنے معمولی عذر (یعنی حیض) کے ایام میں روزہ رکھنا درست نہیں۔ اسی طرح پیدائش کے بعد جتنے روز خون آوے۔ جب خون بند ہو جائے روزہ رکھنا چاہیئے۔ جن لوگوں کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ اُن کو بلا تکلف سب کے سامنے کھانا پینا نہیں چاہیئے۔ بلکہ تعظیم رمضان المبارک لازم ہے۔

روزہ توڑنے کا بیان اور قضا رکھنے کا ذکر

فرض روزے کو بلا کسی شدید تکلیف اور قوی عذر کے توڑنا جائز نہیں۔ پس اگر ایسا سخت بیمار ہو گیا کہ روزہ نہ توڑے تو جان کا اندیشہ غالب ہے۔ یا بیماری بڑھ جانے کا احتمال قوی ہے۔ یا ایسی شدید پیاس لگی ہے کہ مر جائیگا۔ تو روزہ توڑ ڈالنا جائز بلکہ واجب ہے۔ اگر کسی عذر سے روزے قضا ہو گئے ہوں تو جب عذر جاتا رہے جلد ادا کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ زندگی کا بھروسہ نہیں ہے۔ کیا خبر موت آجائے اور فرض ذمہ پر رہے۔ مثلاً بیمار کو مرض سے صحت پانے کے بعد اور مسافر کو سفر سے آنے کے بعد جلد ادا کر لینا چاہیئے۔ قضا رکھنے میں اختیار ہے۔ کہ متواتر (یعنی لگاتار) رکھے یا جُدا جُدا متفرق۔ اگر قضا رکھنے کا وقت پایا لیکن بغیر ادا کئے مر گیا تو مناسب ہے کہ وارث ہر روزے کے بدلے پونے دو سیر گندم صدقہ کریں۔ اور اگر مال چھوڑ گیا ہے۔ اور روزہ کے صدقہ کی وصیّت کر گیا ہے۔ تو ادا کرنا لازم اور واجب ہے۔

سحر کھانے کا بیان اور فضیلت

روزہ کے لئے سحر کھانا مسنون ہے اور باعث ثواب ہے۔ رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ سحر کھایا کرو کہ اس میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ خوب پیٹ بھر کر کھائے، بلکہ ایک یا دو لقمہ یا چھوارے کا ٹکڑا یا دو چار دانے چبائے گا تب بھی سنّت کا ثواب پائے گا۔ افضل و بہتر یہ

ہے۔ کہ رات کے آخری حصہ میں صبح صادق ہونے سے ذرا پہلے کھائے اور دیر ہوگئی اور گمان غالب یہ ہے۔ کہ صبح صادق ہوگئی تو سحر نہ کھانا چاہیئے۔ اور اگر گمان غالب رات کا ہو تو کھالے۔ پھر اگر کسی طرح معلوم ہوا کہ فی الحقیقت صبح ہوگئی تو شام تک رکنا اور پھر قضا رکھنا لازم ہے۔ اور اگر کسی مُرغ یا موذن نے صبح صادق سے پہلے اذان دے دی تو سحر کھانے کی ممانعت نہیں جب تک صبح صادق نہ ہو جائے۔ بلاتکلف کھاؤ پیو۔

روزہ افطار کرنے کا بیان

آفتاب غروب ہو جانے کے بعد افطار میں دیر نہ کرنی چاہیئے۔ البتہ جس روز ابر ہو احتیاط کے لئے دیر کرنا بہتر ہے۔ کھجور یا خرما سے افطار کرنا مسنون اور باعثِ ثواب ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پانی بہتر ہے۔ آگ کی پکی ہوئی چیز مثلاً روٹی چاول شیرینی وغیرہ سے افطار کرنے سے ہرگز کراہت اور نقصان روزہ میں نہیں آتا۔ البتہ بہتر یہ ہے کہ کوئی پھل وغیرہ دوسری چیز ہو اور خرما و کھجور سب سے افضل ہے۔ اگر کسی دوسرے کی دی ہوئی چیز سے روزہ افطار کروگے تو تمہارا ثواب ہرگز کم نہ ہوگا۔ اُسکو اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے ثواب عطا فرمائے گا۔ پھر تم اُس کو واپس کر کے کیوں بخیل کہلاتے ہو؟ البتہ یہ مال حرام یا مشتبہ ہو تو ہرگز قبول نہ کرو۔ حدیث وفقہ سے ثابت ہے۔ اگر روزہ افطار کرنے اور کھانے پینے کی وجہ سے مغرب کی نماز دجماعت میں دس بارہ منٹ کی تاخیر کر دی جائے تو کچھ مضائقہ نہیں اور افطار کرنے سے پہلے یہ مختصر دعا کافی ہے۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ صُمْتُ وَعَلٰی رِزْقِکَ اَفْطَرْتُ ۔ اور افطار کرنے کے بعد یہ پڑھے : ذَھَبَ الظَّمَاءُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰہُ تَعَالٰی۔

تراویح اور وتر کا بیان

عشاء کے فرض اور سنّت کے بعد بیس رکعت تراویح باجماعت مسنون ہے۔ بعض لوگ جو بارہ یا آٹھ بتلاتے ہیں، غلط ہے۔ اگر حافظ بلامعاوضہ پڑھنے والا مل جائے تو تمام رمضان میں ایک قرآن مجید ختم کر دینا چاہیئے۔ اس قدر زیادہ پڑھنا مکروہ ہے جس سے اکثر مقتدیوں کو تکلیف ہو اور تین دن سے کم میں ختم کرنا اچھا نہیں۔ اگر تراویح میں دو رکعت پر بیٹھنا بھول گیا اور پوری چار پڑھ کر سلام پھیرا تو ان چاروں کو دو کی جگہ شمار کرنا چاہیئے۔ چار نہ سمجھے جس شخص کی دو چار رکعت تراویح کی رہ گئیں وہ امام کے ہمراہ باجماعت وتر پڑھ لے اور پھر اپنی باقی تراویح ادا کرے تو درست ہے جس شخص کو عشاء کے فرض باجماعت نہیں ملے وہ وتر کو امام کے ساتھ باجماعت پڑھ سکتا ہے۔ جو حافظ روپیہ کی طمع میں قرآن مجید سناتا ہے۔ اس سے وہ امام بہتر ہے جو اَلَمْ تَرَ کَیْفَ سے پڑھائے۔ اگر اُجرت مقرر کر کے قرآن مجید سُنا جائے تو نہ امام کو

ثواب ہوگا نہ مقتدیوں کو۔ اس قدر جلد پڑھنا کہ حروف کٹ جائیں سخت گناہ ہے۔ نابالغ کو تراویح میں امام بنانا جائز نہیں۔ ہدایہ وغیرہ سے ایسا ہی ثابت ہے۔

اعتکاف اور شب قدر کا بیان

اخیر عشرہ میں اعتکاف سنت ہے۔ اگر تمام بستی میں کوئی شخص بھی نہ کرے تو سب کے ذمہ ترک سنت کا وبال رہتا ہے۔ اعتکاف اسکو کہتے ہیں، کہ اعتکاف کی نیت کر کے مسجد میں رہنا اور سوائے حاجتِ ضروری اور غسل و وضو کے باہر نہ آنا۔ خاموش رہنا اعتکاف میں ہرگز ضروری نہیں، البتہ نیک کلام کرنا اور بدکلامی اور لڑائی جھگڑے سے بچنا چاہیئے۔ اعتکاف اُس مسجد میں ہو سکتا ہے جس میں پنجگانہ نماز جماعت سے ہوتی ہو۔ اگر پورے اخیر عشرہ کا اعتکاف کرنا ہو تو بیس تاریخ کو آفتاب غروب ہونے سے پہلے مسجد میں چلا جائے اور جب عید کا چاند نظر آئے تو اعتکاف سے باہر ہو یہ بھی جائز اور باعثِ ثواب ہے۔ کہ ایک دو روز یا ایک آدھ گھنٹہ کے لئے اعتکاف کی نیت سے مسجد میں رہے۔ شب قدر رمضان کے اخیر عشرہ میں ۲۱ - ۲۳ - ۲۵ - ۲۷ - ۲۹ کو ہونا احادیث میں وارد ہے۔ لہٰذا ان مخصوص راتوں میں بہت محنت سے عبادات میں مشغول رہنا چاہیئے۔

صدقۃ الفطر کا بیان

صدقۃ الفطر اُس شخص پر واجب ہے، جس کے پاس ضروریاتِ خانہ کے علاوہ ساڑھے باون تولہ چاندی یا اسی وزن کے روپے ہوں یا زیور ہوں۔ یا مال و جائداد یا تجارت کا مال ہو یا ساڑھے سات تولہ سونا ہو یا اسی قدر وزن کی اشرفیاں یا زیور ہو یہ ضروری نہیں کہ اس مال پر سال بھر بھی گذر گیا ہو اگر کسی کے پاس بہت مال ہے۔ لیکن قرض اسقدر ہے۔ کہ اگر ادا کیا جائے تو ساڑھے باون تولہ چاندی یا اسی قیمت کا اسباب باقی نہیں رہتا تو اس پر صدقۃ فطر واجب نہیں۔ جس شخص کے پاس مذکورہ بالا مال یا اس سے زیادہ ہو وہ اپنی طرف سے بھی صدقۃ الفطر ادا کرے اور اپنی چھوٹی نابالغ اولاد کی طرف سے بھی۔ صدقۃ الفطر ایک آدمی کا بوزن انگریزی پونے دو سیر گندم ہیں یا اُن کی قیمت اور جو ساڑھے تین سیر ہے۔ اپنے عزیز اقارب سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ایک شخص کو کئی آدمیوں کا صدقۃ الفطر دیا جائے تو درست ہے۔ اور اگر ایک آدمی کا صدقۃ الفطر کئی محتاجوں کو دیدیں تو بھی درست ہے۔ عید کی نماز سے پہلے ادا کر دینا بہت زیادہ ثواب کا باعث ہے۔ جس نے کسی عذر سے یا غفلت سے روزے نہیں رکھے اس پر بھی صدقۃ الفطر واجب ہے۔ بشرطیکہ مذکورہ بالا مقدار مال رکھتا ہو۔ صدقۃ الفطر مؤذن یا امام وغیرہ کو اجرت میں دینا جائز نہیں اور مسجد کی تعمیر اور اُس کے مصارف میں لگانا بھی درست نہیں۔

اسلام کی عالمگیری اور جامعیت

حضرت مولانا شمس الحق صاحب افغانی شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور

(گذشتہ سے پیوستہ)

عالمگیر دین کا چوتھا معیار — "قوتِ اصلاح" اصلاح ضبطِ نفس اور خود غرضی کے مٹانے کا نام ہے۔ جو مذہب اصولاً ان دو امروں کو پورا کرے وہ مذہب عالمگیر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ تمام فسادات کی جڑ یہی دو امر ہیں۔ مسیحی مذہب کا یہ فلسفہ کہ جو آدمی حضرت مسیح کی الوہیت اور ان کے مصلوب ہونے پر ایمان لائے تو اس کا صرف یہی اعتقاد اس کے تمام اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔ ایسا فلسفہ ہے جس سے نہ صرف اصلاح عمل اور نیک کرداری کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ بلکہ نفس انسانی گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کفارے پر یقین کی وجہ سے بڑے سے بڑے گناہ کے ارتکاب میں وہ کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا۔ آج کل بھی اگرچہ مسیحی دنیا پوری تعلیم یافتہ ہو چکی ہے۔ لیکن تمام دنیا کی خونریزیوں کی ذمہ داری ان ہی پر ہے۔ اور اقوام و ملل کی کل خانہ جنگیوں اور کشت و خون کا اصلی سبب ان ہی کی شر انگیز اور فساد خیز سیاست ہے۔

مسلمانوں کی عراق، مصر و شام پر ہزار سال سے زیادہ حکومت رہی۔ لیکن وہاں اب تک عیسائی موجود ہیں۔ مسلمانوں نے چھ سو سال اسپین پر حکومت کی۔ لیکن مسیحیوں کو جب اسپین پر غلبہ حاصل ہوا تو ایک مسلمان کو بھی وہاں زندہ نہ چھوڑا۔ بلکہ مسلمان کی قبروں تک کا بھی باقی رکھنا گوارا نہ کیا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ ضبط نفس کے لئے ان کو قانونِ مجازاۃ اعمال پر یقین نہیں تھا۔ بلکہ عقیدہ کفارہ نے ان کو ہر گناہ کے بد انجام سے بشرطیکہ سیاسی اور دنیوی مصلحت اس کے خلاف نہ ہو بالکل بے پروا کر دیا ——— اس کے برخلاف اسلام کا یہ پختہ تصوّر ہے کہ ہر مجرم یہ یقین

کرے کہ وہ جب بھی کوئی جرم کرتا ہے۔ کائنات عالم کا حاکم اعلیٰ اس کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور اس کی حکومت کے غیر محسوس کارندے اس کے اعمال کو ریکارڈ کرتے رہتے ہیں۔ جو حاکم اعلیٰ کی بارگاہ میں وقت مقررہ پر پیش کئے جائیں گے۔ اور ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہو گا۔ جس پر عدل الٰہی کے تحت مجرم کو سزا دی جائے گی۔ اور وہ سزا ایسی ہو گی جس کی دردناکی کے آگے پوری دنیا کی ساری سزائیں پرکاہ کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتیں۔ اسلام کی یہی قوت اصلاح تھی۔ جس نے عرب جیسی جرائم پیشہ بے تعلیم قوم کو دس پندرہ سال کے مختصر عرصہ میں ایسا پاکیزہ با اخلاق، خدا ترس، عدل پرور قوم بنایا کہ بقول مستشرقین یورپ کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا آسمان سے فرشتے اتر کر زمین پر پھر رہے ہیں۔ اسلام کی اس قوت اصلاح اور حیرت انگیز موثریت کو غیر مسلموں تک نے اس دور فساد کا صحیح علاج بتایا ہے۔ اور درحقیقت عالمگیر دین بھی وہی ہو سکتا ہے۔ جو نوع انسانی کی اس عالمگیر اصلاحی ضرورت کو پورا کرتا ہو۔ اور تخریبی قوتوں کو کنٹرول کر سکتا ہو۔ اصولاً ایسا مذہب صرف اسلام اور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدا سے لائی ہوئی ہدایات ہیں۔

لارڈ برنارڈ شا مشہور ادیب انگلستان کو اقرار ہے کہ "اس دور حاضر کی اصلاح قطعاً ناممکن ہے۔ جب تک پیغمبر اسلامؐ جیسی شخصیت کو موجودہ دنیا کا ڈکٹیٹر نہ بنایا جائے۔"

مسٹر گاروین لکھتے ہیں۔ کہ قدرت کی قوتوں پر فتح پانا نہیں۔ بلکہ انسان کے اندر جو شیطانی قوتیں ہیں۔ ان پر فتح پانا حقیقی کامیابی ہے۔

دین عالمگیر کی جانچ کا پانچواں معیار

حق جس نبی کو ملا ہو، جس زمانے میں ملا ہو۔ اس کو اصولاً تسلیم کرنا دین کے عالمگیر ہونے کی بڑی دلیل ہے۔

غیر سماوی ادیان نے تو سرے سے نبوت کو تسلیم ہی نہیں کیا اور نہ صرف یہ کہ تمام مسلّم رسل و انبیاء علیہم السلام کی صداقت کا انکار کیا۔ بلکہ اس کی جگہ خدا کو انسانی صورت میں متشکل کرنے کا من گھڑت مسئلہ ایجاد کیا۔ جس کو اوتار کہا جاتا ہے، مسیحی اور یہودی ادیان پر بھی جو کہ بنیادی طور پر سماوی دین تھے۔ اس ضمنی تصور کا اثر پڑا۔ چنانچہ انہوں نے بھی حضرت مسیحؑ اور حضرت عزیرؑ کو خدائی شکل دے دی۔ یہود نے حضرت مسیحؑ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کی نبوت و رسالت کا انکار کیا۔ اور عیسائیوں نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دونوں گروہوں نے حق کو تقسیم کیا۔ اور صداقت کو اپنے گروہ کے ساتھ مختص کر دیا۔ اور اس لئے حق کا دائرہ بجائے عالمگیر ہونے کے محدود ہو کر رہ گیا۔ اس کے برخلاف قرآن حکیم نے حق و صداقت کی وحدت کا

اعلان کیا اور مسلمانوں کے لئے تمام انبیاء اور رسل خداوندی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا — چنانچہ فرمایا گیا۔ اٰمن الرسول بما انزل الیہ من ربہ والمومنون کل اٰمن باللّٰہ وملٰئکتہ وکتبہ ورسلہ لانفرق بین احد من رسلہ (الآیۃ) اس آیت میں تفریق بین الرسل یعنی بعض رسولوں کے ماننے اور بعض کا انکار کرنے کو منافی ایمان قرار دیا گیا ہے۔ جو اسلام کے عالمگیر ہونے کی واضح دلیل ہے۔ اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ اسلام ان تمام صداقتوں کا جو مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء کے ذریعہ انسانوں کو دی گئی تھیں۔ ایک آخری اور جامع مجموعہ اور کل ہے جو کسی خاص زمانے اور ملک ونسل سے مختص نہیں بلکہ کل اقوام عالم کی ایک مشترکہ صداقت ہے۔

دینِ عالمگیر کا چھٹا معیار

دین انسانوں کے لئے اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے ایک ضابطۂ حیات ہے۔ اللہ کا انسانوں کے ساتھ صرف ایک ہی تعلق ہے۔ اور وہ تعلق عبدیت ہے۔ اس رشتۂ عبدیت کے سوا خدا کا انسانوں کے ساتھ اور کوئی رشتہ نہیں۔ لہٰذا خدا کی بارگاہ میں جو فرق مراتب ہوگا۔ رشتہ عبدیت کی بنیاد پر ہوگا نہ قوم ونسل کی بنیاد پر۔

الٰہی دین میں یہود ونصاریٰ کی طرح نحن ابناء اللّٰہ واحباءہ اور ہندو مذہب کی برہمنیت کا کوئی نسلی تصور ممکن نہیں ورنہ وہ دین الٰہی اور دین عالمگیر نہ ہوگا۔ بلکہ نسلی برتری کو قائم رکھنے کے لئے ایک علاقائی اور نسلی نظریۂ حیات ہوگا۔ اسلام کے سوا اکثر ادیان میں یہی تصور پایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں برہمن اور شودر کا فرق اور یورپ وامریکہ میں کالے گورے کا امتیاز اس نسلی تصور کا اثر ہے جو اس دور تعلیم و دعویٰ مساوات میں بھی اب تک ان مذاہب کے ماننے والوں میں عملاً موجود ہے۔ یہاں تک کہ ان کے کنوئیں اور مندر اسی طرح سکول اور گرجے الگ الگ ہیں۔ جو سب اس امر کی دلیل ہیں۔ کہ ان مذاہب میں عالمگیر ہونے کی روح موجود نہیں بلکہ محدودیت اور نسلیت ہے۔ اس کے برخلاف اسلام نے اعلان کیا ہے کہ یاایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم۔ کہ نسل وقومیت محض شناخت کے لئے ہے۔ اور شرف انسانی کا مدار کمال عبدیت اور تقویٰ پر ہے۔ پیغمبر اسلامؐ نے اعلان فرمایا۔ لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا للاسود علی الاحمر ولا للاحمر علی الاسود الا بالعلم والتقویٰ۔ یعنی کسی عرب کو عجمی پر اور عجمی کو عرب پر، کالے کو گورے پر اور گورے کالے پر برتری نہیں بجز علم وتقویٰ کے :

نے افغانیم نے ترک وتتاریم — چمن زادیم از یک شاخساریم

تمیز رنگ وبو برما حرام است — کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

دینِ عالمگیر کا ساتواں معیار

شانِ جامعیت ۔ انسانی امراض کی بے شمار قسمیں ہیں۔ اور زندگی کے ہر شعبہ میں امراض لاحق ہوتے ہیں۔ لہذا دینِ عالمگیر وہی ہوگا جس میں تمام امراضِ انسانی کا علاج موجود ہو۔ اور اعتقادی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی عباداتی اور سیاسی، بین الاقوامی تمام شعبہ ہائے حیاتِ انسانی کے لئے اس دین میں کامل ہدایات موجود ہوں۔ تاکہ زندگی کا ہر شعبہ تمام امراض و خامیوں سے پاک ہو کر صحیح توانائی کا حامل ہو سکے ــــ اور فرد جماعت کی زندگی حقیقی و اصلی مسرتوں سے ہم آغوش ہو سکے۔ نہ یہ کہ اس میں صرف چند مختصر مذہبی رسومات ہوں۔ یہی وہ شانِ جامعیت ہے جو فطرتِ انسانی کی طرح ہمہ گیر ہے۔ اور جس سے دینِ عالمگیر کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس معیار پر عالمگیر دین صرف اسلام ہے جس میں زندگی کے تمام شعبوں کے لئے مکمل حکیمانہ قوانین موجود ہیں اور وہ فطرتِ انسانی پہ ایسے فٹ ہیں کہ دشمنانِ اسلام نے بھی آج تک چودہ سو سال گذر جانے کے باوجود کوئی نقص ان میں نہیں نکالا۔ بلکہ غیر مسلم اقوام انسان کے فطری تقاضوں سے مجبور ہو کر اسلامی قوانین کو برابر اپنائے چلی جا رہی ہیں۔

جیسے کہ تحریم شراب اور ضرورتِ طلاق وغیرہ ہیں۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد انگلستان میں تکثیر جرائم کو دیکھ کر وہاں کے ماہرین نے اس کا حل سزا تازیانہ ہی کو قرار دیا۔ اور اس پر عمل بھی شروع کر دیا گیا۔ جس سے جرائم بند ہوئے۔ طلاق کے مسئلہ پر یورپ اور امریکہ نے عمل کیا۔ اور شراب کی مضرتوں کی تحقیق کے بعد بندش شراب کی تحریک امریکہ میں چلائی گئی۔ اگرچہ تمام ذرائع کے استعمال کرنے کے باوجود اس تحریک میں وہ اس لئے کامیاب نہ ہو سکے کہ دینی گرفت سے جن طبائع کو ایک بار آزاد کر کے ان کو خالص حیوانی راہ پر ڈال دیا جائے، اور ایک لمبی مدّت تک وہ اس راہ پہ چلنے کے خوگر ہو جائیں۔ تو ایسے طبائع کو دینی اور روحانی قوت کے بغیر محض قانونی قوت سے راہ پہ لانا دشوار ہے۔

آٹھواں معیار ۔ "معقولیت"

فطرتِ انسانی کا امتیازی وصف عقل ہے۔ جس کے ذریعہ سے انسان صحیح اور غلط میں فرق کرتا ہے۔ اور حق کو باطل سے ممتاز کرتا ہے۔ عقل فطرتِ انسانی کی طرح عالمگیر ہے۔ اس لئے خالق فطرت انسانی نے انسان کے لئے جو دینِ عالمگیر متعین کیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ اس دین کے اصول معقول اور موافق عقلِ انسانی ہوں تاکہ انسان اس کو قبول کر سکے۔ لیکن اسلام کے سوا جس قدر مذاہب و ادیان ہیں ان میں یا تو عاجز اور مخلوق انسان کو خدا بنا دیا گیا ہے۔ یا خدائی میں ان کو شریک کر دیا گیا ہے۔ بدھ مذہب

میں مہاتما بدھ، اور ہندو مذہب میں برہما، وشنو اور مہادیو کا بھی تصور ہے۔ بلکہ ان کے سوا لاکھوں اور کروڑوں دیوتاؤں کو بھی خدائی درجہ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس ان ہستیوں کو خدا کے اس عظیم منصب پر فائز کرنے کا نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی ثبوت نہیں بلکہ ان کے خلاف عقلی دلائل موجود ہیں۔ تقریباً یہی یہودیت اور مسیحیت میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ یہودیت نے حضرت عزیر علیہ السلام کے بارے میں اور مسیحیت نے حضرت مسیح علیہ السلام کے متعلق یہی تصور پیش کیا ہے۔ یہودیت میں خدائی اس قدر دور از عقل ہے۔ کہ ادنیٰ سمجھ بوجھ کا انسان بھی اس کے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ مثلاً یہ کہ یعقوب سے صبح صادق تک تمام رات خدا کشتی لڑتا رہا اور صبح کو جب جانا چاہا تو یعقوب نے بغیر برکت لئے جانے نہ دیا۔ (تورات پیدائش باب ۳۲ - آیت ۲۴) یا مثلاً یہ کہ خداوند زمین پر انسان کے پیدا کرنے سے پچھتایا۔ اور نہایت دلگیر ہوا۔ (تورات پیدائش۔ درس ۵ - ۶)

کیا خدا کے متعلق یہ تصور کوئی معقول تصور ہو سکتا ہے۔ یا عقل کبھی اس کو تسلیم کر سکتی ہے۔ مسیحی الٰہیات کا یہ تصور کہ حضرت مسیح خدا بھی تھے۔ اور پھر بھی یہودیوں کے ہاتھوں سولی پر چڑھائے گئے۔ اور " ایلی ایلی لما سبقتنی " کہہ کر زار و قطار روتے رہے۔ دو متضاد باتوں کا ایک نامعقول مجموعہ ہے۔ اس طرح حضرت مسیح کو خوراک اور کھانے پینے اور دیگر ضروریاتِ زندگی کا محتاج مان کر پھر بھی ان کو خدا تسلیم کرنا انتہائی نامعقول بات ہے۔ اس کے علاوہ باپ بیٹا، روح القدس میں سے ہر ایک کو خدا مان کر یہ کہہ دینا کہ تین ایک ہے۔ اور ایک تین ہے۔ حالانکہ مسیحی دو ایک یا چار کا ایک ہونا تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فیاضی انہوں نے صرف تین کے عدد کے لئے مختص کر دی ہے۔ کہ وہ تین بھی ہے اور ایک بھی ہے۔ اور جب ان سے اس کی حقیقت پوچھی جاتی ہے۔ تو وہ صاف کہہ دیتے ہیں کہ یہ مسئلہ عقل سے بالاتر ہے۔ مگر ہم یہ کہتے ہیں۔ کہ عقل سے بالاتر ہونے کی بجائے عقل کے خلاف ہے۔ پھر تین خداؤں کا تثلیثی تصور اگر ایسا ہے کہ جس میں ہر ایک کی شخصیت محفوظ ہو تو تین کے تین رہے۔ اس کو واحد کہنا غلط ہے۔ اور اگر تینوں شخصیتیں ختم ہو کر ایک وحدت میں منتقل ہوئیں تو وحدت رہی تثلیث نہ رہی۔ بہرحال خدائی حقیقت کو بیک وقت ایک اور تین کہہ دینا خلافِ عقل ہے۔ اور پھر نظام عالم چلانے کیلئے ان تینوں میں سے اگر ایک کافی ہے تو باقی دو فضول رہے۔ اور اگر ایک کافی نہیں جب تک تینوں نہ مل جائیں تو ہر ایک کے لئے جداگانہ خدائی کا تصور غلط ہے۔ بہرحال مسیحی تثلیث قطعاً

خلاف عقل ہے۔ اور جس مذہب کا بنیادی عقیدہ عقل انسانی کے خلاف ہو وہ کیونکہ عالمگیر مذہب ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ نظام عالم کی وحدت و یکسانیت صاف ظاہر کر رہی ہے۔ کہ صرف ایک ہی قوت قاہرہ اس نظام کو چلا رہی ہے۔

نواں معیار — ربط دنیا و آخرت

انسان کو دنیا میں کچھ مدت رہ کر آخرت کی طرف جانا ہے۔ دنیا کی محدود زندگی اس کی شرافت و کرامت کے ظہور کیلئے کافی نہیں ورنہ اس کی شرافت خاک میں مل جائے گی۔ اور حیوان مطلق پر اس کو فوقیت حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ حیوان مطلق زیادہ کامیاب نظر آئے گا۔ کیونکہ وہ ایسی زندگی گزار رہا ہے۔ کہ اس میں نہ غم ماضی ہے۔ اور نہ فکر فردا۔ لیکن انسان قوت شعور کی وجہ سے دن رات گذشتہ احوال اور مستقبل کے خطرات میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس لئے ضروری ہوا کہ انسان کے لئے ایسا مقام حیات ہو جو سراپا مسرت ہو۔ اور جس میں غم کا نام و نشان نہ ہو۔ اور خطرات سے پاک ہو۔ نہ خطرہ مرض ہو اور نہ اندیشۂ مرگ تاکہ اس مقام پر پہنچ کر انسان کی فوق العالم شرافت و کرامت کا ظہور ہو اور وہی مقام آخرت ہے۔ جو انسانی حیات کی آخری منزل ہے۔ اور دنیاوی منزل اس آخروی حیات کے اکتساب اور تحصیل کا ایک ذریعہ ہے۔ انسانی فطرت میں انجام بینی کا جذبہ اس اخروی تصور کا آئینہ دار ہے۔

دنیا میں انسان کا ٹھکانا زمین ہے۔ اور آخرت میں اس کا مقام عالم بالا ہے۔ چونکہ بدن انسانی ارضی ہے۔ اور روح انسانی سماوی۔ لہذا انسان کا ابتدائی مقام سفلی اور آخری مقام علوی ہونا ضروری ہوا۔

اس حقیقت کے پیش نظر صحیح فطری اور عالمگیر دین وہ ہوگا۔ جس میں نہ ترک دنیا کی تعلیم ہو اور نہ ترک آخرت کی۔ بلکہ اس میں دونوں کا حسین امتزاج ہو۔

تاریخ ادیان اور تعلیمات مذاہب سے یہ حقیقت نمایاں ہے۔ کہ موجودہ مسیحی دین میں دین اور دنیا کے تضاد کا تصور موجود ہے۔ اور اس میں اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے نکل جانا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن دنیا دار اور امیروں کا دیندار ہونا ممکن نہیں۔ اس لئے صحیح مسیحی ہونے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تمام تعلقات دنیا کو ترک کیا جائے اور نکاح و اولاد اور ذرائع رزق کے تمام دھندوں سے الگ ہو کر سخت سے سخت ریاضتوں کی تکلیفات کو جھیل کر خدا کو پانے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ گویا مسیحی ہونے کے لئے دنیا سے الگ ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ تھی کہ چونکہ ایسا مذہب دنیا کے ساتھ نہیں چل سکتا تھا۔ اس لئے یورپ کے مسیحیوں نے دین اور دنیا کی تفریق کی راہ اختیار کی۔ اور مسیحیت کو صرف دین کی راہنمائی کے لئے مختص کر دیا اور دنیا کی راہنمائی

کے لئے عقل کی ایجاد کردہ راہ پر چلے۔ درحقیقت خدا کی طرف سے بذریعہ انبیاء علیہم السلام جتنے جتنے ادیان آئے وہ دین و دنیا کے جامع تھے۔ اور ان میں قطعاً دین و دنیا کی جدائی کی تعلیم نہ تھی۔ اور نہ ہی دین و دنیا کو ایک دوسرے کا مخالف اور ضد بتلایا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اسلام کے سوا کوئی سماوی دین اصلی شکل میں محفوظ نہیں رہا۔ بلکہ انسانی تحریف و تبدیل کا شکار ہو گیا۔ اور دیدہ دانستہ قصداً اس کو ایسی شکل دے دی گئی جو دنیا میں پنپنے کے قابل نہ ہو تاکہ آسانی کے ساتھ اس کو انسان کی دنیوی زندگی سے خارج کیا جا سکے۔ اب ظاہر ہے۔ کہ موجودہ شکل میں مسیحی دین دنیوی زندگی کے لئے قابل عمل نہیں رہا۔ چہ جائیکہ وہ دین عالمگیر ہونے کا حقدار ہو سکے۔ اس کے برخلاف اسلام نے صاف اعلان کیا کہ وہ دین و دنیا کا جامع ہے۔ اور انسانی فطرت کے مطابق اس کا مقصد دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی ہے۔ قرآن مجید ہے، "وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین" تم کو دنیا و آخرت دونوں کی سربلندی اور کامیابی نصیب ہوگی بشرطیکہ تم مومن کامل ہو۔ قرآن میں ایک دعا کی تعلیم دی گئی ہے۔ "ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنہ" الآیۃ جس میں دنیا و آخرت دونوں کے فوائد کی تحصیل کی دعا سکھائی گئی ہے۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور جس کو ہم پہلے نقل کر چکے ہیں۔ کہ دنیا کی تحصیل میں ایسی کوشش کرو کہ گویا تمہیں دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے۔ اور آخرت کے لئے ایسی کوشش کرو کہ گویا تم کو کل ہی دنیا سے آخرت کی طرف جانا ہے۔

بیہقی کی حدیث ہے۔ کہ اسلامی عبادات کے بعد سب سے بڑا فرض مسلمان کے لئے رزق حلال کا کمانا ہے۔ ترقی دنیا کی انتہائی شکل حکومت ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ اگر وہ ایمان اور عمل صالح پر قائم رہے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو مضبوط حکومت عطا فرمائے گا۔

وَعَدَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا مِنْکُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّھُمْ فِی الْاَرْضِ۔ الآیۃ

دنیوی ترقی اور حکومت کا مدار فوجی قوت اور آلات حرب پر ہے۔ اور اسلام نے اس کو فرض قرار دیا۔ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل۔ الآیۃ دنیوی ترقی کا مدار اتحاد پر ہے۔ اسلام نے اس کو بھی فرض قرار دیا۔ واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعًا۔ دنیوی برتری کا سب سے بڑا ذریعہ جہاد ہے۔ اسلام نے اس کو بھی فرض ٹھہرایا۔ وجاھدوا فی اللّٰہ حق جھادہٖ۔

اسلام کی چار عبادات میں سے دو عبادتیں یعنی زکوٰۃ و حج صرف اغنیا اور مالدار مسلمانوں سے متعلق ہیں جس سے اس مقصد کا اظہار مقصود ہے۔ کہ تم مال کما کر ان دونوں عبادات کو بجا لاؤ۔ خود مال کو قرآن نے خیر اور فضل اللہ کے نام سے ذکر کیا ہے۔ "ان ترک خیرا ن الوصیۃ" "وابتغوا

من فضل اللہ" بہرحال اسلام میں دنیاوی حیات کے ہر گوشے کے متعلق مکمل احکام موجود ہیں۔ اور اس حکیمانہ انداز کے ساتھ موجود ہیں۔ کہ دورِ حاضر کے عقلاء دنگ رہ جاتے ہیں۔ اس لئے دنیا میں انسانوں کیلئے اگر کوئی عالمگیر دین ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔

دینِ عالمگیر کا دسواں معیار — "دوامِ دین و محفوظیت" جو دین کہ اس کا بقاء دوامی نہ ہو۔ اور نہ اصلی شکل میں محفوظ ہو۔ وہ عالمگیر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ جو دین ایک خاص وقت تک باقی رہے۔ اور پھر اپنا وجود کھو دے وہ دین عالمگیر کیونکر ہو گا۔ اب چونکہ اسلام ہر دور میں باقی ہے۔ اس لئے عالمگیر دین بھی ہر دور میں باقی اور محفوظ ہونا چاہیئے۔

مسیحی دین کا مدار انجیل پر ہے۔ جو محفوظ نہیں نہ سینوں میں نہ کاغذات میں۔ انجیل کے حفاظ نہ پہلے موجود تھے اور نہ اب موجود ہیں۔ حفاظت کا بنیادی ذریعہ درحقیقت یہی تھا جو بغیر قرآن حکیم کے کسی آسمانی کتاب کو نصیب نہ ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جس زبان میں انجیل نازل ہوئی تھی یعنی "عبرانی" اس زبان کا کوئی اصلی نسخہ روئے زمین پر موجود نہیں۔ اور جو عبرانی نسخہ ہے۔ وہ یونانی نسخہ کا ترجمہ ہے۔ اس بناء پر اصلی کتاب گم ہے۔ اور عبرانی زبان بھی زندہ زبان نہیں رہی۔ اب جو بعد کی بنائی ہوئی انجیل ہیں۔ وہ چار ہیں۔ اور اصل انجیل ایک تھی۔ لیکن ان کی تحریف کا بھی یہ حال ہے۔ کہ حقانی نے بحوالہ مسٹر "مل" نقل کیا ہے۔ کہ عہد جدید کے نسخے مقابلہ کئے تو تیس ہزار اختلاف پائے گئے۔ ڈاکٹر "گرلیاخ" نے اور زیادہ نسخوں کا مقابلہ کیا۔ یعنی تین سو پچیس نسخوں کا تو ڈیڑھ لاکھ اختلاف ملے۔ پادری فنڈر، اختتام مباحثہ دینی، مطبوعہ اکبر آباد میں لکھتے ہیں کہ "کتاب کی غلطیاں بہت ہیں۔ اور ہر حال میں تمام یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ صحیح کون ہے"

ہارن صاحب اپنی تفسیر کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں۔ "بلا شک بعض خرابیاں (تحریفات) جان بوجھ کر بعض لوگوں نے کی ہیں۔ جو دیندار مشہور تھے۔ اور اس کے بعد انہیں تحریفات کو ترجیح دی جاتی تھی۔ تاکہ اپنے مطلب کو قوت دیں یا اعتراض اپنے اوپر نہ آنے دیں"

"انجیل متی" کا باب اول و دوم ڈاکٹر ولیمن وغیرہ کے نزدیک الحاقی ہے۔

"مرقس" کی انجیل کے اصل نسخہ کا کوئی پتہ نہیں۔ البتہ یونانی ترجمہ ہے۔

"انجیل لوقا" لوقا معلوم نہیں کہ کون تھا۔ کیونکہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے نہیں۔ اس کی اصلی زبان کا بھی پتہ نہیں کہ کس زبان میں لکھی گئی تھی۔

عیسائی محققین کی رائے ہے کہ "انجیل یوحنا" مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم کی تصنیف

(باقی صفحہ ۵۳ پر)

جناب مولانا حکیم محمود احمد ظفر صاحب سیالکوٹی

اسلام کا تصوّرِ نبوّت

حکیم صاحب موصوف نے اسلام کے نکھرے ہوئے تصوّر نبوّت کو اکابر سلف کی تحقیقات کی روشنی میں پیش فرمایا ہے۔ ہم موصوف کے ممنون ہیں۔ اور اس گرانمایہ مضمون کی تکمیل کی توقع رکھتے ہیں۔　　(ادارہ)

جس طرح اسلام میں خدا، آخرت، اعمال اور عذاب وثواب کا تصوّر دوسرے مذاہب و ادیان سے جدا اور علیحدہ ہے۔ اسی طرح نبی اور اُس کی نبوت کا تصوّر بھی اسلام میں دنیا کے سب ادیان سے جداگانہ ہے۔ کئی مذاہب و ادیان تو سرے سے نبوّت ہی کے قائل نہیں اور کئی نظریۂ نبوت کے قائل تو ہیں۔ لیکن نبی میں حق تعالیٰ کے حلول و اتحاد اور قرابت و ولادت کے نظریہ کے قائل ہیں۔ جو کہ خالق ومخلوق کی سرحدوں کو آپس میں ملا دیتا ہے۔ کئی مذاہب نبی کو خدا کا وجود تصوّر کرتے ہیں۔ جو کہ انسانی ہیکل میں عالمِ لاہوت سے عالمِ ناسوت میں کچھ خاص اغراض کے تحت جلوہ گر ہوتا ہے۔ کئی مذاہب نبوّت کے متعلق کچھ ایسے نظریات رکھتے ہیں۔ جن سے حق تعالیٰ اور نبی کے درمیان کسی نہ کسی طریقہ سے شراکت اور مماثلت کی کچھ نہ کچھ پرچھائیاں ضرور نظر آتی ہیں۔ لیکن نبوّت کا جو تصوّر اسلام نے پیش کیا ہے۔ وہ ان سب ادیان اور مذاہب سے علیحدہ اور بالاتر ہے۔ وہ نہ تو براہمہ کی طرح نبی کو اللہ رب العزّت کا اوتار اور بروز تصوّر کرتا ہے۔ اور نہ ہی عیسائیت کی طرح اس کو ایک عام انسان کی طرح گناہوں سے ملوّث گردانتا ہے۔ بلکہ وہ خدا تعالیٰ کو اپنے مقام پر اور نبی کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ —— ع

گر فرق مراتب نہ کنی زندیقی

وہ کبھی بھی نبی کو ایسے مقام پر نہیں لے جاتا، جہاں عبدیت اور معبودیت کی سرحدیں ملتی ہوں۔ اور خالق و مخلوق کے مابین شراکت کے شبہات پیدا ہوتے ہوں۔ اور جہاں عیسائیت کی طرح نبی اور حق تعالیٰ کے درمیان کسی قسم کا کوئی التباس واقع ہوتا ہو۔ جس سے پھر اُس کی ایسی تاویلیں کرنی پڑیں۔

کہ وہ پھر عقلی اور فکری مسئلہ نہ رہے۔ بلکہ ایمان کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہو جائے۔
عیسائیت کی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کہ پہلے تو انہوں نے جناب عیسیٰ علیہ السلام میں الوہیت کی کچھ شؤن وصفات دکھائیں۔ اور پھر جب دنیا کے مفکروں نے عقل و فکر اور علم و خرد کی کسوٹی پر اس کو پرکھنا چاہا تو ایمان کا ایک بھید کہہ کر راہ فرار تلاش کی۔ چنانچہ عقیدۂ اتھانیسس میں جو کہ عیسائی عقائد میں سے ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ صاف اور صریح الفاظ میں آتا ہے:

"خدا میں تین شخص ہیں۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ خدا اس پاک تثلیث کا پہلا شخص جو بیٹے اور روح القدس کا شروع ہے۔ یہ تینوں شخص آپس میں بالکل برابر ہیں۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ اس لئے تینوں یکساں الٰہی عزت کے لائق ہیں۔ یسوع مسیح سچا خدا اور سچا آدمی بھی ہے۔ اور مقدسہ مریم سچ مچ خدا کی ماں بنی۔ باپ خاص کر قادر مطلق اس لئے نہیں کہلاتا کہ وہ زیادہ قدرت والا ہے۔ بلکہ اس لئے کہ پاک نوشتوں میں قدرت باپ کی، دانائی بیٹے کی اور پاکیزگی روح القدس کی کہلاتی ہے۔ (مسیحی تعلیم باب پاک تثلیث ص ۱۹-۲۷ لاہور)

اس خلاف عقل اور خلاف فطرت بات کو جب مفکرین نے فکر و نظر کی نگاہ سے جانچنا شروع کیا تو ان کے اعتراضات سے بچنے کے لئے اور مسیحی بھیڑوں کو اپنے سے جدا نہ ہونے دینے کے لئے یہ کہہ دیا:

"ہم اس بات کو ٹھیک نہیں سمجھ سکتے کیوں کہ ایمان کا یہ ایک بھید ہے[۱]۔" (حوالہ مذکور ص ۲۰)

اس کے برعکس اسلام نے جو تصور نبوت پیش کیا ہے۔ اس میں خالق و مخلوق کی سرحدات الگ الگ ہیں۔ اور ان دونوں کی آپس میں کوئی شراکت نہیں۔

حکیم الامت دہلویؒ نے اس نظریہ کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے ــــــ

الوجدان الصریح یحکم بان العبد	وجدان صریح اس بات کا اقرار کرتا ہے
عبد وان ترقیٰ والرب رب وان	کہ بندہ بندہ ہی ہے خواہ وہ کتنا ہی
تنزل وان العبد قط لا یتصف	ارتقائی منازل کو طے کیوں نہ کر جائے۔

---

[۱] عیسائی عقائد کی واقفیت کے لئے میری کتاب "مسیحیت پر ایک تحقیقی نظر" (اردو) اور "Islam's Contribution to civilization" (انگریزی) کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جو "ادارہ معارف اسلامیہ" سیالکوٹ سے مل سکتی ہیں۔

بالوجوب او بالصفات اللازمة للوجوب [1]

اور ربّ ربّ ہی ہے۔ خواہ وہ اپنے بندوں کے کتنا ہی قریب کیوں نہ آجائے اور بندہ کبھی درجۂ وجوب یا اُن صفات کو جو کہ وجوب کے لئے لازم ہیں، متصف نہیں ہو سکتا۔

اس مسئلہ کو ویسے تو امام ابو الحسن الشعریؒ۔ قاضی ابوبکر الباقلانیؒ۔ ابن حزم اندلسیؒ۔ ابو اسحٰق الفرائینی۔ عبد الکریم الشہرستانی۔ امام غزالیؒ۔ امام فخر الدین رازیؒ۔ علامہ سیف الدین آمدی ابن خلدونؒ اور ابن تیمیہؒ وغیرہ متکلمین اور محققینِ اسلام نے اپنی کتابوں میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ لیکن متقدمین میں امام غزالیؒ نے "المنقذ من الضلال" اور "معارج القدس" میں اور متاخرین میں حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے "حجۃ اللہ البالغہ" میں نہایت تحقیق اور علمی پیرایہ میں اس مسئلہ کو بیان فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت شاہ صاحبؒ نے تو ہزار برس کی تحقیقات کا عطر اور نچوڑ "حجۃ اللہ البالغۃ" کے چند اوراق کے سینہ میں بند کر کے رکھ دیا ہے۔

نبی کی تعریف

نبوّت کے دوسرے پہلوؤں پر گفتگو کرنے سے قبل لفظ "نبی" کی تعریف کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے ــــ بعض کا قول ہے کہ نبی کا لفظ "نَبَاوَۃ" سے مشتق ہے جس کا معنی ہے "اونچی شے" چونکہ نبی اپنے مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے بہت اونچے مقام کا حامل ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو نبی کہتے ہیں [2]۔ لیکن اکثر کے نزدیک نبی کا لفظ مشتق ہے۔ "نَبَاٌ" سے جس کا معنی ہے خبر۔ لیکن لغتِ عرب میں ہر خبر "نَبَاٌ" نہیں کہلاتی بلکہ نَبَاٌ اُس خبر کو کہتے ہیں۔ جس میں تین چیزیں ہوں۔ ۱۔ خبر فائدے کی ہو۔ ۲۔ فائدہ بھی عظیم الشان ہو۔ ۳۔ اُس خبر سے سننے والے کو اطمینانِ قلب اور یقین کامل حاصل ہو۔

اس معنی کی رو سے نبی کی تعریف یہ ہوئی کہ وہ انسان جس نے حق تعالیٰ کے بندوں کو حق تعالیٰ کی جانب سے اُن کے نفع اور فائدے کی ایسی عظیم الشان خبریں سنائی ہوں جن تک اُن کی نارسا عقلوں کی رسائی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتیں وہی ہوں گی جو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہوں۔ اور پھر ان خبروں پر اطمینان یا علم اُسوقت حاصل ہوگا جب خبر دینے والا اُس پر اللہ ربّ العزّت کی طرف سے کوئی دلیل بھی پیش کرے یا صرف اس کی زندگی ہی اتنی پاکیزہ اور اتنی اعلیٰ اور مقدّس ہو کہ اس کے متعلق کذب کا وہم وگمان بھی نہ ہو سکے اور اس کی بات سنتے ہی لوگوں کو یقین آجائے۔ معلوم ہوا کہ صرف "نبی" کا لفظ ہی لغتِ عرب کی رو سے ان حقائق پر روشنی ڈالتا ہے [3]۔

۱۔ تفہیمات الٰہیہ ص۱۸۴ ۲۔ کتاب المسامرۃ فی شرح المسایرۃ جلد ۲ ص۴۲، المسایرۃ ص۱۱۸، مجمع البحار جلد ۳ ص۳۲۹ منتہی الارب جلد ۴ ص۱۶۹، فتح الباری شرح صحیح بخاری جلد ۶ ص۲۷۸۔ ۳۔ مفردات امام راغب اصفہانی ص۴۹۹۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس تعریف کو ذرا اور لطیف پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں :

"اسلام کی زبان میں نبی وہ مقدس شخصیت ہے جسے اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی منشا اور مرضی بتاتا ہو۔ اور پھر وہ ان احکام کو دوسروں تک پہنچاتا ہو۔ دین و دنیا کے مصالح اور منافع کے لئے ایک دستور اساسی، ایک قانونِ حیات اور ایک نظام العمل پیش کرتا ہو۔ ایک مصلح ہو اور اپنے اندر اصلاحی داعیات بھی رکھتا ہو" (النبوات ص۱۷۲ تا ص۱۷۴)

حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے نبی کی تعریف میں اور لطافت اور اختصار پیدا فرما دیا ہے۔ فرماتے ہیں :

"نبوت توجہ الی الحق اور توجہ الی الخلق کی صفت کے کمال کا نام ہے۔ دوسرے لفظوں میں نبی وہ ذات ہے جو ہر وقت حق کی طرف بھی متوجہ رہے اور خلقِ خدا پر بھی نظر رکھے۔ حق کی طرف توجہ کرنے سے خلق خدا کی طرف اس کی توجہ کم نہ ہو اور خلقِ خدا کا خیال حق کی لگن میں خلل انداز نہ ہو" (مکتوبات)

نبوت کی اس بحث کو حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ایک اور انداز میں بیان فرمایا ہے جس کا ماحصل یہ ہے :

"علم و عمل اور فضل و کمال کے لحاظ سے انسانوں کے مختلف درجات ہیں۔ ان میں سب سے اعلیٰ اور بلند و بالا درجہ "مفہمین" کا ہے۔ یہ لوگ ایک خاص اصطلاح اور مخصوص طریقِ اصلاح کے حامل ہوتے ہیں۔ ان کی قوت ملکیہ بہت بلند ہوتی ہے۔ داعیۂ حقانی اور صحیح اور سچے جذبات کے ساتھ ان کے لئے دنیا میں ایک خاص نظام کو قائم کرنا آسان اور سہل ہوتا ہے۔ اور یہ لوگ وہ خاص نظام قائم کرنے کے لئے مبعوث ہوا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ کی طرف سے ان پر علوم عالیہ اور احوال الٰہیہ کا ترشح ہوتا ہے۔ "مفہم" کی سیرت یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ معتدل مزاج ہوتا ہے۔ اس کی خلقت، پیدائش اور اخلاق و عادات بالکل صحیح اور درست ہوتی ہیں۔ اس کے اندر جزئی رذائل اور جزئی واقعات کی بناء پر زیادہ اضطراب نہیں ہوا کرتا۔ وہ نہ تو اس قدر تیز ہوتا ہے۔ کہ صرف کلیات و تخلیات ہی میں الجھ کر رہ جائے۔ اور نہ اس قدر بلید اور غبی کہ صرف جزئیات ہی میں الجھا رہے اور جزئیات سے کلیات تک اور صورت سے روح تک پہنچنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ سنت راشدہ اور ہدایت کے راستہ کی پیروی کرنے والا ہوتا ہے۔

عبادات میں بھی وہ بلند مرتبے کا حامل ہوتا ہے۔ معاملات میں بھی لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف برتنے میں اُس کا معیار بہت بلند ہوتا ہے۔ وہ اپنے فیصلوں میں شخصی اور انفرادی بھلائی کا لحاظ نہیں کرتا۔ بلکہ تدبیر کلّی اور منفعت عامہ کا لحاظ رکھتا ہے۔ وہ کسی کو ایذا پہنچانا بالکل گوارا نہیں کرتا۔ اور اگر کسی کو تکلیف اور ایذا پہنچ بھی جاتی ہے تو کسی عارضی سبب کی وجہ سے یعنی یہ کہ منفعت عامہ کا حصول اور بڑی تعداد کا فائدہ چھوٹے سے نقصان سے حاصل ہو تو وہ اس جزئی تکلیف اور اس شخصی نقصان کو گوارا کر لیتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے امور میں عالمِ غیب کی طرف مائل اور راغب رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اُس کی بات چیت، کام کاج، چہرے اور پیشانی کے تیوروں سے بھی میلان و رغبت کے اثرات مترشح ہوتے ہیں۔ بلکہ اس کی زندگی کی ہر شان اور ادا سے میلان و رغبت ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اپنے کو ایسا پاتا ہے کہ عالمِ غیب سے اسکی تائید ہو رہی ہے۔ اُسے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ ریاضت سے قربِ الٰہی حاصل ہو جاتا ہے۔ اور اس قربِ الٰہی سے اُس پر سکون وطمانیت کے وہ دروازے کھل جاتے ہیں۔ جو دوسروں کے لئے نہیں کھلتے۔

"مفہمین" اپنی مختلف استعداد اور قابلیت کی وجہ سے مختلف مدارج کے حامل ہُوا کرتے ہیں۔

اوّل ــــ وہ مفہم جس کو اکثر وبیشتر ریاضات وعبادات کی وجہ سے حق تعالیٰ شانہٗ کی جانب سے تہذیبِ نفس اور تزکیۂ نفس کے علوم کی تلقین ہُوا کرتی ہے۔ ایسا مفہم "کامل" کہلاتا ہے۔

دوم ــــ وہ مفہم جسے اکثر وبیشتر اخلاقِ فاضلہ، تدبیرِ منزل اور اسی قسم کے دوسرے علوم کا القاء ہوتا رہتا ہے۔ ایسا مفہم "حکیم" کہلاتا ہے۔

سوم ــــ وہ مفہم جسے عمومی تدبیر وسیاست اور نظامِ کلّی کی اصلاح کے علوم کا القاء کیا جاتا ہے۔ اور اُسے لوگوں میں عدل وانصاف کے نظام کے قیام اور ظلم وجور کے استیصال کی توفیق عطا کی جاتی ہے۔ ایسا مفہم "خلیفہ" کہلاتا ہے۔

چہارم ــــ وہ مفہم جس پر ملاءِ اعلیٰ کا نزول ہوتا ہے اور اُسے وہاں کی حضوری حاصل ہوتی ہے۔ وہاں کی تعلیم سے وہ سرفراز ہوتا ہے۔ اور اس سے مختلف قسم کے تصرّفات اور خرقِ عادت امور صادر ہوتے ہیں۔ وہ "مؤید بروح القدس" کہلاتا ہے۔

پنجم ــــ وہ مفہم جس کی زبان وقلب میں انوار وتجلیات ہوں۔ لوگ، اُس کی رفاقت وصحبت اور پند وموعظت سے مستفید ہوں اور وہ انوار وتجلیات صرف اس کی ذات ہی تک محدود نہ ہوں

بلکہ وہ اس کے رفقائے خاص تک میں بھی منتقل ہوں جس سے وہ کمال و ارتقاء کے مدارج عالیہ تک پہنچ جائیں۔ ایسے مفہم کو "ہادی" اور "مزکی" کہتے ہیں۔

ششم ـــــ وہ مفہم جس کے علم کا بڑا حصّہ امّت اور ملّت کے اصول و قواعد اور اسکی مصلحتوں کی واقفیت پر مبنی ہو اور جس میں ملّت کے منہدم ارکان کو دوبارہ قائم کرنے کی طاقت ہو۔ ایسا مفہم "امام" کہلاتا ہے۔

ہفتم ـــــ وہ مفہم جس کے قلب میں یہ القاء کیا جائے کہ وہ لوگوں کو اُن بڑے بڑے مصائب و آلام سے خبردار کرے جو دنیا میں اُن لوگوں کے اعمال کے نتیجہ کے طور پر مقدر ہو چکے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی قوم کے متعلق اُس کو بتایا گیا ہے۔ کہ وہ اپنی بداعمالی اور مسلسل نافرمانی کی وجہ سے ملعون و مردود ہو چکی ہے، وہ اس قوم کو اس سے آگاہ کر دیتا ہے۔ یا بعض اوقات اپنے تجردِ نفس اور صفائی باطن کی وجہ سے وہ قبر و حشر میں پیش آنے والے واقعات کو معلوم کر لیتا ہے۔ اور وہ اس سے لوگوں کو آگاہ اور باخبر کر دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو "منذر" کہتے ہیں۔

ہشتم ـــــ وہ مفہم کہ جب حکمتِ الٰہی کا یہ تقاضا ہوتا ہے۔ کہ کسی ایسے مفہم کو مبعوث فرمائے جو لوگوں کو ظلمات اور تاریکیوں سے نکال کر نور اور روشنی میں لائے اور گمراہی اور ضلالت کے راستہ سے موڑ کر ہدایت و اصلاح کا راستہ دکھائے تو حق تعالیٰ اپنے بندوں پر لازم اور فرض کر دیتا ہے۔ کہ وہ اپنے ذہن و قلب کی ساری قوتیں اُس کے حوالہ کر دیں اور ملاءِ اعلیٰ میں بھی تاکید ہوتی ہے۔ کہ جو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرے اس سے خوشنودی اور جو اس کی مخالفت کرے اس سے ناخوشی کا اظہار کیا جائے۔ اور وہ لوگوں کو ان امور سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری لوگوں پر لازم قرار دے دیتا ہے۔ ایسے مفہم کو "نبی" کہتے ہیں۔" (حجۃ اللہ البالغہ باب حقیقۃ النبوۃ وخواصہا ص ۹۶)

نبی کی ان سب تعریفوں کا عام اور سادہ زبان میں خلاصہ یہ ہے۔ کہ انسان روح اور مادہ کی ترکیب کا نام ہے۔ اس کی روح اور مادہ کی ترکیب نے اس کی حیات کو بھی دو حصّوں میں منقسم کر دیا ہے۔ یعنی ایک اس کی مادی حیات اور دوسری اس کی روحانی حیات۔ ان دونوں زندگیوں میں سے ہر زندگی کے طور و طریق الگ الگ ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ جس نے انسان کو زیورِ حیات سے مرصّع کیا اُس نے اس بات کی ذمہ داری بھی لی ہوئی ہے۔ کہ اس کی زندگی کی تمام ضروریات کا کفیل میں ہوں۔ چنانچہ فرمایا :

وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ـــ زمین پر چلنے والا کوئی نہیں مگر اُس کی روزی

رِزْقُهَا۔ (ھود ع ۱)　　اللہ کے ذمہ ہے۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا	اور جو اللہ سے ڈرے وہ اس کے لئے
وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ	راستہ نکال دیتا ہے۔ اور اس کو رزق
(طلاق ع ۱۷)	ایسی جگہ سے دیتا ہے۔ جہاں سے گمان

بھی نہ ہو۔

انسان کی اس مادی حیات کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے خلاق عالم نے طرح طرح کے انسان پیدا فرمائے جنہوں نے دوسرے انسانوں کو مادی زندگی بسر کرنے کے طریق سکھائے۔ زندگی بسر کرنے میں جو جو ضروریات انہیں لاحق ہوئیں اُن کو پورا کیا۔ چنانچہ ان حضرات نے انسانوں کو کاشتکاری کے اصول، خورد ونوش کے طریق، ازالۂ مرض کی تدابیر، بود و باش کے سامان، سواری وغیرہ کی ضروریات غرضیکہ اُن کی مادی حیات کی تکمیل میں قدم قدم پر اُنہیں جتنی بھی ضروریات سے دوچار ہونا پڑا۔ ان لوگوں نے اُن کو پورا کیا۔

انسان بیمار ہوا، انہوں نے دوا دی۔ یہ بھوکا ہوا، انہوں نے کھانا کھلایا۔ یہ ننگا ہوا انہوں نے اس کی عریانی کے ازالہ کیلئے کپڑا بناکر پیش کیا۔ اس کو دفع مضرت کے لئے لڑنے کی ضرورت پیش آئی، انہوں نے اس کو تلوار، نیزہ اور رائفل وغیرہ آلات حرب مہیا کئے۔ تاکہ یہ انسان بطریق احسن اپنی مادی زندگی کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے۔

اس مادی زندگی کے ساتھ ساتھ اس کی روحانی زندگی کی ضروریات کا جن کو ہم اصول تمدن، طریقۂ معاشرت، اخلاقِ حسنہ اور تقویٰ وغیرہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں، دور شروع ہوتا ہے۔ اور یہ حیات ایسی ہے جو صرف حضرت انسان کے لئے مختص ہے۔ مادی زندگی میں حیوان بھی انسان کے ساتھ مشترک ہے۔ مگر اس روحانی زندگی میں انسان کو دیگر حیوانات سے شان امتیاز حاصل ہے۔ کیونکہ اگر اس کی یہ روحانی حیات نہ ہو تو اس کی مادی زندگی کی جنت جہنم بن جائے اور یہ اشرف المخلوقات جماعت درندوں کا غول اور چرندوں کا گلہ ہو کر رہ جائے۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

مجاہد کبیر سید احمد شہیدؒ کے جہاد کا ایک درخشندہ باب

ہمارے اسلاف اپنے کردار کے آئینہ میں

اکوڑہ کی جنگ

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ

صبح کو اکوڑہ کا رئیس امیر خاں خٹک ملاقات کے لئے آیا اور شرف بیعت سے مشرف ہوا اور عرض کی "میرا بھتیجا فیروز خاں کا بیٹا خواص خاں میرا مخالف ہو گیا ہے۔ اس نے بدھ سنگھ کو اکوڑہ بلایا ہے۔ اگر وہ سکھ سردار اکوڑے میں آکر دریائے لنڈے کے درے اترا تو تمام ملک سمہ[1] کو تاراج کر دے گا۔ مناسب یہ ہے کہ آپ یہاں سے کوچ کریں اور اس کو وہیں روکیں۔"

دوسرے روز آپؒ وہاں سے کوچ کر کے موضع خویشگی میں رونق افروز ہوئے۔ نماز مغرب کے بعد میاں عبداللہ نے آکر عرض کیا: "یہ بستی چھوٹی ہے۔ یہاں کھانے کی جنس کم ملتی ہے۔ اور لشکر میں لوگ بہت ہیں۔" آپ نے اس وقت تمام حاضرین سے فرمایا: "ہم دعا کرتے ہیں تم سب مل کر آمین کہو۔" پھر آپ سر برہنہ دعا میں مشغول ہوئے۔ لوگ آمین کہتے تھے۔ جب دعا سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ بھائیو! ہر شخص اس وقت سے عشا کی اذان تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ پڑھے۔ سب نے ویسا ہی کیا۔ اذان عشا کے بعد ایک شخص آپؒ کے پاس آیا اور عرض کی کہ آٹے کی کشتی دریا کے کنارے موجود ہے۔ اپنے لوگوں کو بھیج کر منگوا لیں۔ آپؒ نے یہ سن کر میاں عبداللہ سے کہا کہ تم کچھ لوگوں کو لے کر جاؤ اور وہاں سے آٹا لاؤ اور یہاں لا کر جا بجا پر جمع کر دو۔ عبداللہ تو اس طرف آٹا لینے کو گئے اور آپؒ نے وضو کر کے لوگوں کو نماز عشاء پڑھائی۔ جب لوگ وہاں سے آٹا لائے، یہاں لشکر میں ایک جا جم پر جمع کر دیا۔ میاں عبداللہ نے آکر اطلاع کی کہ سب آٹا وہاں سے آ گیا۔ آپؒ نے پوچھا کس قدر ہوگا؟ کہا: پندرہ من کے قریب ہوگا۔ آپؒ نے فرمایا کہ جب تک ہم وہاں نہ آئیں، آٹا تقسیم نہ ہو۔ آپؒ وہاں تشریف لے گئے۔ اس میں سے تھوڑا آٹا اٹھا لیا۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و رزاقی اور اپنی مفلسی و محتاجی کا دیر تک بیان کرتے

---

[1] سمہ سے مراد وہ میدانی علاقہ ہے جو دریائے سندھ اور سرحدی پہاڑوں کے درمیان ہے۔ پشاور اور ضلع مردان اسی علاقے میں واقع ہیں۔

رہے۔ پھر وہ آٹا بسم اللہ کرکے اسی انبار میں ڈال دیا۔ اور حجام کے دونوں کونے لوٹا دئے۔ اور فرمایا کہ دو روزہ سب کو تقسیم کر دو۔ اس وقت لشکر میں پندرہ سو کے قریب لوگوں کی جمعیت تھی۔ کچھ کم پانچ سو ہندوستانی اور کچھ اوپر دو سو قندھاری اور کوئی آٹھ سو کے قریب ملکی لوگ ہوں گے۔ شیخ باقر علی صاحب آٹا تقسیم کرنے لگے۔ جو ہندوستانی اور قندھاری تھے ان سب کو دو روزہ دیا۔ اور جو لوگ وہیں نزدیک کے رہنے والے تھے، اپنے اپنے گھروں سے اکثر کھاکر آئے تھے۔ اور جو اپنے گھروں سے کھاکر نہیں آئے تھے، ان میں سے جس نے مانگا، اس کو بھی دیا۔ جب سب کو تقسیم کر چکے تو کچھ آٹا بچ رہا۔ آپؒ نے فرمایا کہ وہ آٹا ہمارے باورچی خانے کے منتظم شیخ قادر بخش کے حوالے کر دو۔ اسی وقت لوگوں نے اپنی اپنی جماعت میں روٹیاں پکائیں اور کھاکر اپنے عہدے پر قائم رہے۔

لشکر میں ابتداء سے چار جماعتیں تھیں۔ اور چار جماعت دار تھے۔ ایک جماعت خاص مشہور تھی اور اس میں سید صاحبؒ بنفس نفیس تھے۔ وہ جماعت مولوی محمد یوسف صاحب کی تھی۔ وہ ہمیشہ کوچ اور مقام میں داہنی جانب کو ہوتی تھی۔ دوسری جماعت مولانا محمد اسمٰعیل صاحب کی تھی۔ وہ کوچ اور مقام میں آگے ہوتی تھی۔ تیسری جماعت سید محمد یعقوب صاحب کی تھی۔ اس جماعت میں ان کے نائب شیخ بڈھن تھے۔ سید محمد یعقوب صاحب ٹونک میں تھے۔ یہ جماعت کوچ اور مقام کے وقت بائیں طرف رہتی تھی۔ چوتھی جماعت اللہ بخش خاں کی تھی، وہ پیچھے رہتی تھی۔ متفرق اشخاص بیچ میں ہوتے تھے۔ سید صاحبؒ کا خیمہ خاص جماعت کے قریب نصب کیا جاتا تھا۔

اسی نظم و انتظام کے ساتھ آپؒ نے موضع خویشگی سے کوچ کرکے ۱۸ر جمادی الاوّل ۱۲۴۲ھ (۱۸ر دسمبر ۱۸۲۶ء) کو نوشہرے میں قیام کیا۔ آپؒ نے حکومت لاہور کو شرعی دستور کے مطابق اس مضمون کا اعلام نامہ تحریر فرمایا تھا:

(۱) یا تو اسلام قبول کرلو ---- (اس وقت ہمارے بھائی اور ہمارے مساوی ہو جاؤ گے، لیکن اس میں کوئی جبر نہیں۔)

(۲) یا ہماری اطاعت اختیار کرکے جزیہ دینا قبول کرو۔ اس وقت ہم اپنے جان و مال کی طرح تمہارے جان و مال کی حفاظت کریں گے۔

(۳) آخری بات یہ ہے کہ اگر تم کو دونوں باتوں میں سے کوئی بھی منظور نہیں، تو لڑنے کے لئے تیار ہو جاؤ، مگر یاد رکھو کہ سارا یاغستان اور ملک ہندوستان ہمارے ساتھ ہے۔ اور تم کو شراب کی محبت اتنی نہ ہوگی، جتنی ہم کو شہادت کی ہے[۱]۔

---

[۱] "سوانح احمدی" میں اس اعلام نامے کے ذکر کے ساتھ اتنا اضافہ اور ہے: "دربار لاہور نے براہ نخوت اس اعلام نامے کا کچھ جواب نہیں دیا۔ بلکہ قاصد آورندۂ اعلام نامہ کو دربار سے نکلوا دیا۔ اس سبب سے جنگ کی تیاری شروع

ایک مخبر نے آکر خبر دی کہ بدھ سنگھ لشکر کے ساتھ اکوڑے میں داخل ہوگیا ہے۔ یہ سن کر آپؒ نے فرمایا کہ خبردار کوئی شخص کمر نہ کھولے، ہوشیاری سے تیار رہیں اور جس کو کھانا پکانا ہو، دن ہی کو پکاکر کھالے۔

اس وقت تک مجاہدین کو سکھوں سے جنگ کی نوبت نہیں آئی تھی۔ جنگی مصلحتوں کا تقاضا تھا کہ پہلا معرکہ کامیاب ہو اور دشمن پر مجاہدین کی جانبازی کا نقش قائم ہوجائے۔ حریف کی تعداد سات ہزار بیان کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلے میں جن مجاہدین پر اعتماد کیا جاسکتا تھا، وہ صرف پانچ سو ہندوستانی اور دو سو قندھاری تھے۔ ملکیوں کی شجاعت اور میدانِ جنگ میں ثابت قدمی کا ابھی تک کوئی تجربہ نہ تھا۔ دراصل ابھی مجاہدین کی تعداد و استعداد اس درجے کو نہیں پہنچی تھی کہ اتنے کثیر التعداد دشمن سے میدان کی جنگ لڑی جائے۔ اس تمام نشیب و فراز کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا گیا کہ پہلا معرکہ شبخون کی صورت میں ہو تاکہ اصل اور مرکزی طاقت کو محفوظ رکھتے ہوئے دشمن پر ضرب لگائی جائے اور اس کو ہراساں کردیا جائے۔

نمازِ ظہر کے بعد آپؒ نے اپنے خاص خاص لوگوں سے کچھ مشورہ کیا اور چاروں جماعت والوں کو حکم دیا کہ اپنی اپنی جماعت سے اچھے اچھے چست و چالاک جوانوں کے نام ایک فرد پر لکھ کر لائیں اور ان میں سے جس کے پاس اچھے درست ہتھیار نہ ہوں دوسرے بھائیوں سے بدل لیں [۱]

وہ چاروں جماعت دار ناموں کی فردیں لے کر آئے اور آپؒ کے حوالے کی۔ آپؒ نے اس فرد کو دیکھ کر چند نام اُن میں سے نکال دئے۔ اور اُن کی جگہ دوسروں کو درج کیا۔ وہ لوگ اکثر اکوں میں تھے۔ اُن میں عبدالمجید خاں جہاں آبادی رائے بریلی والے بھی تھے۔ اُن کو بخار آتا تھا۔ سیّد صاحبؒ نے اسی سبب سے اُن کا نام نہیں رکھا۔ یہ خبر سُن کر وہ اسی بخار کی حالت میں بستر سے اُٹھ کر آئے۔ اور آپؒ سے پوچھا کہ آپ نے میرا نام فرد میں کیوں داخل نہیں کیا۔ آپؒ نے انکی تسلی کی اور فرمایا کہ تم کو بخار آتا ہے، اس لئے ہم نے تمہارا نام نہیں لکھایا۔ انہوں نے کہا: "حضرت آج کافروں سے پہلا مقابلہ ہے۔ گویا آج سے جہاد فی سبیل اللہ کی بنا قائم ہوتی ہے۔ میں ایسا سخت بیمار نہیں ہوں کہ جا نہ سکوں۔ میرا نام آپ مجاہدین میں ضرور داخل فرمائیں"

آپؒ نے ان کا نام بھی فرد میں لکھایا اور کہا: "بارک اللہ وجزاک اللہ۔ اللہ تعالیٰ تم کو دین کی کوشش کی زیادہ توفیق عنائت کریں"

---

[۱] قلمی مکتوب سیّد صاحبؒ

۲۰ رجمادی الاول ۱۲۴۲ھ کو نماز مغرب کے بعد آپؒ نے اللہ بخش خاں صاحب جماعتدار کو بلایا اور لڑائی کے چند قانون جو آپؒ نے اس وقت مناسب جانے، ان کو تعلیم فرمائے اور کہا: "ہم نے تم کو اس پچھلے کی جماعت کا امیر کیا۔ تم اس وقت کچھ لوگ لے کر دریا کے پار اس کنارے پر ٹھہرو۔ جب اور لوگ یہاں سے جاکر تمہارے پاس جمع ہوں، تب سب صاحبوں سے کہہ دینا کہ گیارہ گیارہ بار سورۃ لِاِیلٰفِ پڑھ لیں۔ پھر وہاں سے کوچ کرنا۔ اللہ تعالیٰ مدد کرے گا۔"

خان ممدوح چند آدمی ساتھ لیکر کشتی پر سوار ہو کر دریا کے پار گئے۔ اور وہاں ٹھہر کر باقی لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ یہاں لشکر میں سیّد صاحبؒ نے نماز عشاء کے بعد جن کے نام فرد میں تھے ان کو بلایا اور فرمایا: "بھائیو! یہاں سے وہ مکان جہاں جانا ہوگا، چھ سات کوس ہے۔ جس کو اتنی دور جانے اور پھر آنے کی بخوبی طاقت ہو وہ تو جائے، نہیں تو نہ جائے۔ اور جس کو بیماری وغیرہ کا کچھ اور عذر ہو۔ وہ بھی بیان کر دے۔ ہم اس کے عوض کسی اور کو بھیجیں" وہاں جو حاضر تھے۔ وہ تو سب جانے ہی کی نیّت سے آئے تھے۔ اور ہر کسی کو یہی اشتیاق تھا کہ ہم جائیں، اگرچہ کچھ عُذر بھی تھا، مگر جب آپؒ نے اپنی زبان سے یوں فرمایا، تب ان میں سے دو چار آدمیوں نے اپنی اپنی ناطاقتی وغیرہ کا عُذر معقول بیان کیا۔ آپؒ نے ان کے عوض دوسروں کو شامل کر دیا۔

پھر آپؒ ہندوستانی و قندھاری اور مُلکی لوگوں میں سے تقریباً نو سو آدمیوں کو لے کر دریا کے کنارے تشریف لے گئے۔ آدمیوں کی تفصیل یہ ہے کہ ایک سو چھتیس ۱۳۶ یا کچھ کم و بیش ہندوستانی تھے۔ اور اسّی کے قریب قندھاری تھے اور باقی مُلکی لوگ تھے۔

اس عرصے میں اللہ بخش خاں صاحب بھی چند آدمیوں کے ہمراہ کشتی پر سوار ہو کر آپؒ سے ملنے اور رخصت ہونے کو اُس پار اتر آئے۔ آپ نے لوگوں سے فرمایا کہ ہم جناب الٰہی میں دعا کرتے ہیں، تم سب مل کر آمین کہو۔ پھر آپؒ سر کھول کر دعا میں مشغول ہوئے کہ "اے پروردگار، قادر بے نیاز اور اے کریم کارساز، بندہ نواز، یہ تیرے بندے محض عاجز و خاکسار، ضعیف و ناچار ہیں۔ تیری ہی مدد کے امیدوار ہیں۔ تیرے سوا ان کا کوئی حامی و مددگار نہیں۔ یہ صرف تیری ہی رضامندی اور خوشنودی کو جاتے ہیں۔ تو ہی ان کی مدد کر۔" اسی طرح کے الفاظ اپنی زبانِ مبارک سے دیر تک فرماتے رہے۔

دعا کے بعد سب لوگ آپس میں ملے اور ایک دوسرے سے اپنا کہا سنا، معاف کرایا اور کہا: اگر اللہ تعالیٰ زندہ سلامت لائے گا تو پھر ہم تم ملیں گے اور جو وہاں شہید ہو گئے تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ ہماری ملاقات جنّت میں ہوگی۔"

پھر ہر شخص سید صاحبؒ سے دست بوس ہو کر کشتی پر سوار ہوا۔ اس وقت وہاں تین کشتیاں تھیں۔ تین تین پھیروں میں سب لوگ پار اتر گئے۔ اور سورۂ لایلٰف گیارہ گیارہ بار پڑھ کر اکوڑے کی طرف روانہ ہوئے۔

یہ سب مجاہدین جاتے جاتے فوجِ مخالفین کے ورے پاؤ کوس کے فاصلے پر ایک نالے پر ٹھہرے۔ وہاں امیر جماعت اللہ بخش خاں صاحب سے مولوی امیر الدین صاحب ولایتی نے مشورۃً کہا "یہ ملکی لوگ، جو ہمارے ساتھ ہیں۔ اگر ان کو آگے کریں تو ہمیں ان پر بھروسہ نہیں۔ شاید وقت پر طرح دے جائیں۔ اور اگر اپنے لوگوں کو آگے کریں، تو وہ یہاں کے راہ گھات سے ناواقف ہیں۔ کیا تدبیر کرنی چاہئے؟ پھر آخر کو یہ صلاح ٹھہری کہ خدا پر توکل کر کے اپنے ہی لوگوں کو آگے کیا جائے۔ مگر ملکی لوگوں میں سے ایک شخص کو جو وہاں کے حال سے واقف تھا۔ آگے بھیجا۔ کہ جا کر لشکرِ مخالف کی خبر لائے کہ کس طرف لشکر کے لوگ غافل ہیں۔ اور کس طرف ہوشیار۔

سکھوں کے لشکر کا معمول تھا۔ کہ جہاں کہیں اُترتے، لشکر کے گرد خار دار درخت کاٹ کر سنگر بنا لیتے تھے۔ کہ یکایک کسی غنیم کی فوج نہ آپڑے۔ کچھ دیر میں وہ آدمی وہاں کی خبر لایا اور کہا کہ فلاں طرف لوگ غافل ہیں۔ اور لوگوں کو لے جا کر اُن کے سنگر کے قریب کھڑا کر دیا۔

اس وقت لشکرِ کفار میں گھریالی نے تین پہر پر تین گھڑیاں بجائیں۔ ادھر سے باوازِ بلند اللہ اکبر، اللہ اکبر کہہ کر سب مجاہدین سکھوں کی فوج میں گھس گئے۔ اس عرصے میں اُدھر کے ایک پہرے والے نے بندوق چلائی۔ قضائے الٰہی سے وہ گولی شیخ باقر علی صاحب کے لگی۔ وہ اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ اور کہا "کوئی بھائی میرے پاس کے ہتھیار لے لے۔ یہ اللہ کا مال ہے۔ میرا کام تو ہو گیا۔ مگر ارمان دل میں باقی رہا۔

مجاہدین میں جو لوگ دلاور و جرّار و کار آزمودہ تھے، وہ دس دس پانچ پانچ سکھوں کے ہر خیمے کی طرف جھکے اور اُن کی طنابیں کاٹ کاٹ کر گرانے لگے۔ اور نو تعلیم مجاہدین سے کہا کہ تم ان خیموں کے آدمیوں کی خبر لیتے جاؤ۔ یہ لوگ تو اُن کی مار کوٹ میں مشغول ہوئے اور ملکی لوگ لوٹنے پر جھکے۔ کسی نے گھوڑی لی، کسی نے ہتھیار لئے۔ کسی نے کپڑے وغیرہ لئے۔ اور اپنے اپنے گھروں کو چلنے لگے۔ یہاں مجاہدین میں سے کسی نے چار آدمی مارے، کسی نے دس، کسی نے زیادہ۔ عبد المجید خاں بریلوی نے چودہ پندرہ آدمیوں کے قریب مارے۔ اس عرصے میں ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیر الدین صاحب دو تلواریں باندھتے تھے۔ اپنی ایک تلوار خاں صاحب کو دی۔ اس تلوار سے بھی کئی سکھ مارے۔

عبد اللہ بسم اللہ نام ایک مخنّث تھا، اُس کے پاس برچھی تھی۔ اُس نے سات یا آٹھ آدمی برچھی سے

مارے۔ اسی طرح اللہ بخش خاں اور شمشیر خاں جمعدار اور غلام رسول خاں اور غلام حیدر خاں اور شیخ ہمدانی اور علی حسن، شیخ بڈھن، شیخ رمضانی، مرزا ہمایوں بیگ اور بہت صاحبوں نے دشمن کے آدمی مارے اور جوانمردی اور شجاعت کی داد دی۔ بَقِیَّۃُ السَّیْفِ شکست فاش کھاکر بھاگنے لگے جس نے جس طرف موقع پایا اپنی تلوار بندوق لے کر فرار ہوگیا۔ دس دس پانچ پانچ مجاہدین اُن کے ڈیروں خیموں کی طرف متفرق ہوگئے۔

اس عرصے میں چند مجاہدوں نے اُن کے توپ خانے پر قبضہ کر لیا۔ اس اثناء میں توپخانے کے ایک غلامی یا گولہ انداز نے رن مہتاب کو آگ لگادی۔ اور اسکی ڈور کھینچ کر اُسے بلند کیا۔ اور آپ وہاں سے ایک طرف بھاگ گیا۔ اُس وقت روشنی سے گویا تمام لشکر میں دن ہوگیا۔ اُس وقت تک مجاہدین میں گنتی کے کوئی دس پندرہ آدمی زخمی اور شہید ہوئے ہوں گے۔ خود بدھ سنگھ اس رات اکوڑہ میں تھا لشکر میں فقط اس کا خیمہ کھڑا تھا۔ ایک طرف لشکر کے باہر ان بھاگتے ہوئے سکھوں نے ایک چھوٹا سا نقارہ بجایا اور اس روشنی میں دیکھا کہ مجاہدین تھوڑے ہیں۔ کہیں کہیں دس دس پانچ پانچ نظر آتے ہیں۔ وہ بندوقیں لیکر یکبارگی حملہ آور ہوئے۔ مجاہدین بھی جا بجا سے سمٹ کر ایک جانب ہوگئے۔ اور دونوں طرف سے بندوقیں چلنے لگیں۔ مجاہدین کیطرف سے کسی نے آواز دی کہ اب یہاں سے نکل چلو۔ لوگوں نے نکلنے کا ارادہ کیا۔ فتح علی عظیم آبادی کہتے ہیں۔ کہ اس وقت میں نے دیکھا کہ اللہ بخش خاں جو ہمارے امیر تھے چند آدمیوں کو اپنے ہمراہ لئے باہر نکلنے کے ارادے سے چلے آتے ہیں۔ اور ان کے پیچھے سکھ ہلّہ کرتے آتے ہیں۔ اس وقت شیخ ہمدانی اور علی حسن قواعد کے ساتھ بھرماری کی بندوقیں چلا رہے تھے۔ اُسوقت ہماری طرف ایک ایک دو دو شہید اور زخمی ہونے لگے۔ چنانچہ سید رستم علی صاحب بھی اسی جگہ زخمی ہوئے۔ اس عرصے میں اللہ بخش خاں امیر شیخ ہمدانی اور علی حسن کے برابر پہنچے کہ لشکر سے باہر نکلیں۔ تب انہوں نے آواز دی: "اللہ بخش خاں صاحب تم کو تو حضرت نے سردار کر کے بھیجا تھا۔ اب تم اس وقت کفار کے مقابلے سے نکلے جاتے ہو!" یہ بات سُن کر اللہ بخش خاں صاحب اپنے ہمراہیوں کو لے کر کافروں کے مقابلے کو چلے۔ ان کو دیکھ کر اور لوگ بھی پھرے اور ان میں شریک ہوگئے۔ سب ملاکر کوئی پچاس ساٹھ غازی ہوں گے۔ وہ بندوقیں چلانے لگے۔ جب سکھ اور نزدیک آگئے، تب قرابین اور شیر بچے سر کرنے لگے۔ پھر آخر کو تلواروں کی نوبت آئی، یہاں تک کہ تلواروں کے مارے ان کا ہلّہ ہٹا دیا۔ اللہ بخش خاں صاحب اور اُن کے اکثر ہمراہی اس ملّے میں شہید ہوگئے اور بہت غازی زخمی بھی ہوئے۔

یہ حال دیکھ کر اکثر لوگوں نے جو باقی رہ گئے تھے، قصد کیا کہ ہم بھی جاکر انہیں میں شامل ہوں۔ تب

اکبر خاں صاحب نے جو بڑے دلاور اور جہاں دیدہ آدمی تھے، لوگوں کو روکا اور کہا: "بھائیو! کیا آج ہی لڑنا ہے۔؟ اب یہاں سے چلو۔ انشاء اللہ تعالیٰ پھر کافروں کو ماریں گے" اور سب کو سمجھا کر پھیر لائے۔ اس وقت صبح صادق خوب نمودار ہو گئی تھی۔ وہاں سے دریا بہت ہی نزدیک تھا۔ کوئی کوئی لوگ جو آگے نکل گئے تھے ان میں سے کسی نے جا کر دریا پر اذان کہی جس سے پیچھے والوں کو معلوم ہوا۔ کہ ہمارے کچھ لوگ آگے پہنچ گئے۔

پھر لوگوں نے سنگر سے نکل کر انتظام کے ساتھ راستہ لیا۔ اور مخالفین میں سے کسی نے اُن کا تعاقب نہیں کیا۔ وہاں سے کوس بھر پر تیمّم کر کے نمازِ فجر پڑھی۔ نماز کے بعد وہاں سے چلے اور اسی گھاٹ پر آئے جہاں سے اُترے تھے۔ سیّد صاحبؒ بہت سے لوگوں کے ساتھ دریا پر کھڑے تھے۔ آپؒ نے کچھ لوگوں کو مجاہدین کی تقویت کے لئے بھیجا کہ ایسا نہ ہو سکھوں نے تعاقب کیا ہو۔ یہ لوگ باقی ہمراہیوں کے انتظار میں عصر تک اسی پار رہے۔ جب پیچھے کے اکثر لوگ دو دو چار چار کر کے آ گئے، تب سب کشتی پر سوار ہو کر اُترے اور پہر رات گئے تک اکثر لوگ دریا میں اُتر کر لشکر میں داخل ہوئے اور سیّد صاحبؒ سے مصافحہ کیا۔ اور ملاقات کی۔ آپؒ نے شہداء کے لئے دعائے مغفرت کی۔ لوگ ایک ایک دو دو کر کے صبح تک آتے رہے۔ زخمیوں کا معالجہ اور مرہم پٹی ہوئی۔ ڈیرے ڈیرے، جہاں سے لوگ گئے تھے۔ اُن کا شمار کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ ہندوستانیوں سے کوئی چھتیس آدمی شہید ہوئے اور قندھاریوں سے کوئی چالیس پینتالیس اور دونوں میں سے کل تیس چالیس آدمی زخمی ہوئے۔ سکھوں کے سات سو آدمی مارے گئے۔ یہ واقعہ ۲۰ جمادی الاوّل ۱۲۴۲ھ (بمطابق ۲۰ دسمبر ۱۸۲۲ء) چہارشنبہ اور پنجشنبہ کی درمیانی شب کا ہے۔[1]

اس جنگ کے شہداء کے نام مع اُن کی وطنیت کے لکھے جاتے ہیں۔ تاکہ معلوم ہو کہ ان کی سعادت اور شوقِ شہادت اُن کو کہاں کہاں سے کھینچ کر لایا تھا۔

۱۔ شیخ باقر علی عظیم آبادی۔ ۲۔ اللہ بخش خاں مورانوی (ضلع اناؤ) امیر سریہ۔ ۳۔ عبدالمجید خاں جہاں آبادی رائے بریلوی، ۴۔ شمشیر خاں جمعدار مورانوی (ضلع اناؤ) ۵۔ شیخ بڈھن۔ ۶۔ شیخ رمضانی مورانوی (ضلع اناؤ)۔ ۷۔ شیخ ہمدانی خالص پوری ملیح آبادی۔ (ضلع لکھنؤ) ۸۔ علی حسن گنتوی (نزد مانکپور ضلع پرتاپ گڈھ) ۹۔ غلام حیدر خاں خالص پوری۔ (ضلع لکھنؤ) ۱۰۔ غلام رسول خاں خالص پوری۔ ۱۱۔ خدا بخش خاں۔ (بمبئی) ۱۲۔ شادل خاں خیرآبادی۔ (اودھ) ۱۳۔ کریم بخش خاں بڈھانوی (روہیلکھنڈ) ۱۴۔ کریم بخش مسجد فتحپوری (دہلی)

---

[1] حضرت سیّد صاحب علیہ الرحمۃ اس رات کو لیلۃ الفرقان سے تعبیر کیا کرتے تھے۔ اور کیا عجب کہ حضرت شہید کے انفاس قدسیہ اور شہداء کے مقدس خون ہی کی برکات کا کرشمہ ہو کہ سرزمین اکوڑہ آج دارالعلوم حقانیہ کی شکل میں مرکز علم و عرفان بنی ہوئی ہے۔
(الصدیقی نوشہرہ)

۱۵۔ میاں جی احسان اللہ بڑھانوی۔ ۱۶۔ شیخ معظم جگدیس پوری (ضلع پرتاپ گڈھ)۔ ۱۷۔ دین محمد کورہرستانوی[1] بلیواڑہ (اودھ) ۱۸۔ عباد اللہ مئو (ضلع اعظم گڈھ) ۱۹۔ قاضی طیب۔ ۲۰۔ امام خاں خیرآبادی۔ ۲۱۔ اولاد علی مادھوی۔ ۲۲۔ ہمایوں لبیک لکھنوی۔ ۲۳۔ امام الدین خاں رامپوری۔ ۲۴۔ سید محمد لہاروی (ضلع مظفر نگر) ۲۵۔ محمد کمال ترخم پوری۔ ۲۶۔ نہیم خاں حسین پوری (ضلع مظفر نگر)۔ ۲۷۔ سید عبدالرحمٰن سنیاملی۔ (ضلع مظفر نگر)۔ ۲۸۔ شیخ مخدوم مسجد فتحپوری (دہلی) غلام نبی خاں گوالیاری، ۲۹۔ غلام نبی خاں گوالیاری۔ ۳۰۔ عبدالرزاق دیوبندی۔ ۳۱۔ جواہر خاں لکھنوی۔ ۳۲۔ منور خاں ملیح آبادی۔ (اودھ) ۳۳۔ عبدالجبار مولانوی۔ ۳۴۔ سید عبدالرحمٰن سندھی۔ ۳۵۔ حسن خاں سندھی۔ ۳۶۔ اکبر خاں خالص پوری (اودھ)۔

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا اسمٰعیل صاحبؒ نے سید صاحبؒ سے کہا: "یہاں جو واقعہ گذرا ہے۔ اس کا حال ہندوستان لکھ کر بھیجنا ضروری ہے۔ اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ فرمایا "بہتر ہے۔" مولانا نے پوچھا "جو لوگ شہید ہوتے ہیں ان سب کے نام بھی خط میں لکھے جائیں۔ یا یوں ہی مجمل تذکرہ کر دیا جائے۔؟ آپؒ نے کچھ دیر سکوت کیا۔ پھر فرمایا۔ "یوں لکھ دیجئے کہ عنایتِ الٰہی سے ہم سب لوگ یہاں خوشحال ہیں" مولانا نے کہا، "حضرت میں آپؒ کے کلام کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ ذرا تفصیل فرمائیں۔ آپؒ نے فرمایا: "مفصل یہ ہے کہ جو لوگ یہاں زندہ موجود ہیں یہ بھی خوشحال ہیں۔ اور جو شہید ہوئے اور اپنی مراد کو پہنچے وہ ہم سب سے زیادہ خوشحال ہیں۔"

اس جنگ کا اثر مسلمانوں اور مخالفین پر خاطر خواہ ہوا۔ مسلمانوں کے دل بڑھ گئے اور حوصلے بلند ہوئے۔ دربار لاہور کی بھی آنکھیں کھلیں۔ ملکی سردار جوق در جوق آکر مبارکباد دینے لگے۔

سردار بدھ سنگھ نے اس ہزیمت کے بعد موضع شیدو سے جہاں وہ اکوڑے کے بعد مقیم تھا۔ پیچھے ہٹ جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن اٹک کا قلعہ دار یہ خبر سن کر مانع ہوا۔ کہ اس وقت یہاں سے پیچھے ہٹنا مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ یہاں سے چلے جائیں گے تو مجاہدین کا لشکر خیرآباد اور اٹک کو تباہ کر دے گا۔ یہ سن کر بدھ سنگھ نے موضع شیدو میں لشکر کے گرد سنگر باندھنے کا سامان جمع کیا۔ امیر خاں سے یہ سن کر سید صاحبؒ نے صبح کو نوشہرے سے کوچ فرمایا۔ اور جو لوگ وہاں زخمی تھے۔ ان کی خدمت اور خبر گیری کے واسطے دو صاحبوں (عبدالقیوم اور سید امانت علی) کو چھوڑا اور اس روز تمام لشکر کے ساتھ مصری بھانڈے میں مقام کیا۔ دوسری منزل موضع تورڈھیر میں کی ——— *

---

[1] کورہرستانوں ضلع رائے بریلی میں ہے۔

احوال وکوائف دارالعلوم

از حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحق صاحب مدظلہ

درسِ بخاری شریف کی اختتامی تقریب کے افادات

مورخہ ۸ شعبان بعد از نماز ظہر دارالعلوم کی شاندار مسجد کے صحن میں ختم بخاری کی سادہ مگر مؤثر اور رقت انگیز تقریب منعقد ہوئی جس میں طلبۂ دورۂ حدیث (اس سال جن کی تعداد ۶۳ تھی) کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ دارالعلوم اور باہر کے حضرات نے بھی شرکت کی۔ حضرت شیخ الحدیث نے بخاری شریف کی آخری حدیث کی تشریح کے ساتھ ساتھ فارغ التحصیل ہونے والے طلبہ کو ان کے فرائض اور نازک ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی اور مفید نصائح فرماتے ہوئے حدیث کی اجازت عطا فرمائی اس تقریر کو بعض حضرات نے نوٹ کر لیا۔ گو اس کا زیادہ حصہ علمی اور طالب العلموں کے افادہ کے لئے تھا۔ مگر اسی حلقہ (جس کا قارئین الحق میں کافی حصہ ہے) کے فائدہ کے لئے اسے مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ اس تقریب کے اختتام میں فارغ ہونے والے طلبہ کی آئندہ دینی وعلمی کامیابی اور تمام مسلمانوں بالخصوص معاونین و وابستگان دارالعلوم اور ملک کے حقیقی فلاح وکامیابی کیلئے نہایت خشوع والحاح سے دعائیں کی گئیں۔

—— ادارہ ——

باب قول اللّٰہ ونضع الموازین القسط لیوم القیامۃ وان اعمال بنی آدم وقولھم یوزن وقال مجاھد القسطاس العدل بالرومیۃ ویقال القسط مصدر المقسط وھو العادل واما القاسط فھو الجائر۔ حدثنا احمد بن اشکاب قال حدثنا محمد بن فضیل عن عمارۃ بن القعقاع عن ابی زرعۃ عن ابی ھریرۃ رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ قال قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کلمتان حبیبتان الی الرحمٰن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان سبحان اللّٰہ وبحمدہ سبحان اللّٰہ العظیم۔

قیامت کے دن اقوال واعمال کا وزن

امام بخاری علیہ الرحمۃ اس باب سے قیامت کے دن انسان کے اقوال واعمال کا وزن ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کلام اللہ جس سے خدا تعالیٰ متصف ہے۔ اور جو کلام صفتِ خداوندی ہے۔ غیر مخلوق اور غیر موزوں ہے۔ اور وہ کلام جس سے ہمارا تلفظ وابستہ اور متعلق ہے۔ وہ چونکہ ہمارا ہی قول وعمل ہے تو اسے تولا جائے گا۔ گویا وارد و مورود میں فرق ہے۔ وارد (تلفظ) موزوں ہے۔ اور مورود کلام اللہ ہے جو نہیں تولا جائے گا۔ خود الفاظ قرآن قدیم ہیں۔ اور یہ کلام لفظی کلام نفسی کا مظہر ہے۔ اسی نکتہ کو امام بخاریؒ نے محمد بن یحییٰ الذھلیؒ کو مسئلہ خلق قرآن کے متعلق جواب دیتے ہوئے اشارہ فرمایا کہ لفظی بالقرآن مخلوق یعنی قرآن مجید پر میری جنبش لسانی حادث ہے۔ اس سے

لوگوں نے امام بخاریؒ کی طرف خلق قرآن کے قائل ہونے کی نسبت کی۔ حالانکہ امام کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا۔ بلکہ یہی کہ میرا تلفظ جو متعلق قرآن ہے۔ وہ مخلوق ہے جیسے میزان میں بھی تولا جائے گا۔ تو کلام اللہ بحیثیت صفت خداوندی جو موردہ ہے غیر مخلوق ہے۔ اور بحیثیت تلفظ جو وارد ہے، مخلوق ہے۔

وان اعمال بنی ادم وقولھم یوزن۔		بیشک انسان کے اعمال واقوال تولے جائیں گے۔

چونکہ تلنے والے اعمال وعبادات (صلوٰۃ وصوم حج و زکوٰۃ) وجنایات مختلف الانواع ہیں۔ اس لئے و نضع الموازین القسط میں (ہم عدل والنصاف کے ترازو کھڑے کر دیں گے) موازین جمع وزن کا صیغہ لایا گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ قیامت کے دن قرطاس (کاغذ) کا ایک معمولی پرزہ جو خلوص ویقین کے ایک کلمہ سے مزیّن ہوگا۔ ——————

—— جرائم اور معاصی کے بڑے بڑے دفاتر اور دواوین پر بھاری ہو جائے گا۔ ذلك فضل اللہ واللہ ذو الفضل العظیم۔ مصنّف نے یہاں بھی روایت ابو ہریرہؓ میں لفظ ثقیلتان فی المیزان سے مدعا ثابت کیا۔ کہ اقوال کا بھی وزن ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ والوزن یومئذ الحق۔ (اور واقعی اس دن وزن بھی ہوگا۔) اللہ کے ہاں کوئی کام مشکل نہیں۔ اور آج کل تو اعراض بھی تولے جاتے ہیں۔ درجۂ حرارت وبرودت کے ذریعہ گرمی اور سردی کا وزن ہوگا۔ ووجدوا ما عملوا حاضرا۔ (جو کچھ انہوں نے کیا تھا اسے موجود پائیں گے۔)

فلسفۂ جدیدہ سائنس کی اکثر اشیاء نے شریعت کے کئی مسائل کی تائید کی۔ حضرت شاہ صاحب (مولانا انور شاہ) سے فلسفۂ قدیم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ فلسفۂ قدیمہ شریعت سے مخالف ہے۔ اور موجودہ سائنس اور جدیدہ فلسفہ سے شریعت کی تائید ہوتی ہے۔ ان چیزوں کا شریعت سے تصادم کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ——

لغوی تحقیق | قسط کا معنیٰ عدل والنصاف ہے۔ مصنّف اپنی عادت کے مطابق حدیث یا قرآن کے ایک لفظ کے مادہ کی مناسبت سے دوسرے الفاظ کی بھی جو قرآن وحدیث میں اس مادہ سے مستعمل ہوئے ہوں تشریح فرماتے ہیں۔ یہاں قسطاس کی شرح بھی کر دی کہ حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اہل روم کے نزدیک اس کا معنیٰ عدل ہیں۔ پھر معرب ہونے کے بعد اس لفظ نے حکم بھی عربی کا لیا۔ قسط مجرد مصدر ہے مقسط کا مصنّفؒ نے اشارہ فرمایا کہ مصدر خواہ مفرد ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے مفرد وجمع دونوں کی توصیف کی جاسکتی ہے۔ اس لئے موازین کے بعد قسط مفرد لایا گیا۔ مُقسط کا مصدر اقساط ہے۔ مگر باعتبار حذف زوائد قسط کو مصدر کہا —— باب افعال کا ہمزہ

کبھی سلب کے لئے آیا کرتا ہے۔ تو سلب ظلم نہیں۔ مگر عدل اس لئے مقسط مزید بھی بمعنی عادل ہے۔
ارشادِ خداوندی ہے : ان اللہ یحب المقسطین۔ (بیشک اللہ تعالیٰ عدل کرنیوالوں کو پسند کرتا ہے)
اس کے مجرد سے اسم فاعل قاسط ہے۔ جس کا معنی جابر اور ظالم ہے۔ جیسے فرمایا۔ واما القاسطون فکانوا لجہنم حطبا۔ (اور لیکن جو ظالم ہیں سو وہ دوزخ کا ایندھن ہوں گے)

گویا یہ لفظ اضداد سے ہے۔ ظلم و عدل دونوں معانی میں مستعمل ہے۔ اس لئے تو قرآن و حدیث کا سمجھنا بغیر علمی مہارت کے ممکن نہیں۔ گو اسکی حفظ اور تلاوت بھی باعث اجر ہے۔ مگر اس کا صحیح فہم ہر کسی کا کام نہیں۔ حجاج بن یوسف اس امت کے ظالم حاکم گذرے ہیں۔ ہزاروں اولیاء و علماء و صحابہ کو جبراً قتل کیا پھر بھی قرآن سے شغف تھا۔ قرآن مجید کے اعراب و حرکات اسی نے لگائے ہیں۔ اس وقت کے حاکم ظالم اور جابر ہونے کے باوجود علوم دینیہ سے باخبر ہوتے قرآن اکثر حکام کو یاد ہوتا اور کئی حکام تو حافظ حدیث بھی ہوتے۔ وہ شخص حافظ حدیث کہلاتا جسے کم ازکم ایک لاکھ احادیث یاد ہوتیں۔ تو حجاج بن یوسف نے ایک مرتبہ مشہور تابعی حضرت سعید بن جبیرؓ سے اپنے بارے میں اس کی رائے دریافت کی تو سعیدؓ نے جواب دیا کہ میری رائے میں تو قاسط عادل ہے۔ لوگ حیران ہوئے کہ کس طرح حضرت سعیدؓ نے حجاج بن یوسف کی تعریف و توصیف کی اور اسے عادل و منصف کہا۔ حجاج نے فوراً ان کا تحیر و تعجب دور کر دیا اور حاضرین سے کہا کہ تم اس کے مطلب کو نہیں سمجھے اس نے مجھے ظالم اور مشرک کہا۔ اس نے قاسط بمعنی ظالم اس آیت سے لیا۔ واما القاسطون فکانوا لجہنم حطبا۔ اور عادل سے اس کا مراد مشرک ہے جیسے کہ اس آیت میں وارد ہے۔ واما الذین کفروا بربھم یعدلون۔ (اور جو کافر ہیں وہ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں۔)

حدیث کی شرح | حضرت ابوہریرہؓ سے مروی حدیث پر مصنفؒ نے اپنی جلیل القدر اور عظیم کتاب ختم فرمائی جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ دو کلمے ہیں۔ جو رحمان کے ہاں بہت پسندیدہ و محبوب ہیں۔ اور جو اس کو پڑھے، اس کا ورد کرے وہ بھی اللہ تعالیٰ کو محبوب ہوگا۔ اور اس پر بہت بڑا اجر و ثواب پائے گا۔ سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم۔ دیگر اسماء قدسیہ کا ذکر نہیں بلکہ رحمان کا لفظ آیا ہے جس میں اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا وصف رحمانیت ہی ہے۔ جو اتنے عظیم انعامات و اکرامات کا باعث بن رہا ہے ـــــ پھر فرمایا کہ یہ دو کلمے زبان پر اور تلفظ میں بہت آسان ہیں۔ کہ مختصر جملے ہیں۔ جنہیں غبی اور ذہین سب بآسانی یاد کر سکتے ہیں اور

جس سے حسنات کا پلڑا بھاری ہو جاتا ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہ۔ اس میں اللہ جل جلالہ کے ہر عیب وبرائی اور ہر قسم کے شرک اور نقصانات سے تنزیہ وتقدیس ہے۔ جس سے شرک کی بنیادیں کٹ جاتی ہیں۔ سبحان اللہ العظیم اس میں ساری عظمتیں اور کبریائیاں اللہ کے لئے خاص کردی گئیں اور اللہ کا اتصاف بصفات الکمال کر دیا گیا۔ سبحان اللہ میں تنزیہ وتزکیہ اور وبحمدہ میں ثبوت صفات کمالیہ ہے۔ اور العظیم میں عظمت ربانی کی تصریح ہے۔ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کسی کا محتاج نہیں یہ سب موجودات اسی کی قدرت کے کرشمے ہیں۔ یہ اصل توحید ہے۔ جب نعم خداوندی مستحضر ہو جاتی ہیں۔ تو انسان بے ساختہ حمد و تعریف کرنے لگتا ہے کہ سبحان اللہ وبحمدہ —— مگر فرط محبت سے اگر کسی کی نظر صرف رحمان پر رہے کہ جب وہ رحمان ہے۔ تو طاعت کی کیا ضرورت ہے۔ تو سبحان اللہ العظیم میں اسکی عظمت وجلالت کی طرف اشارہ ہوا کہ وہ ہر عظیم سے بزرگ وبرتر ہے۔ تو عظیم سے مقام خوف اور رحمان سے مقام رجاء کی طرف توجہ دلائی گئی۔ ان کلمات کا وہی مفہوم ہے جو کلمہ طیبہ کا ہے۔ کہ لاالٰہ میں تنزیہ وتقدیس اور نفی شرک ہے۔ اور الا اللہ میں اعتراف وحدانیت اور ثبوت صفت کمالیہ ہے۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث کو کتاب کا خاتمہ بنا کر اس طرف بھی اشارہ کیا کہ جس شخص کا خاتمہ کلمۂ توحید پر ہو تو دخل الجنۃ وہ جنت کو داخل ہو گا۔ (کمافی الحدیث الآخر) نیز اشارہ ہے۔ کہ الفاظ کلمہ توحید بوقت نزع ضروری نہیں بلکہ اس کا مفہوم جن الفاظ سے بھی ادا ہو اور وہ کلمہ جو تقدیس وتحمید خداوندی پر مشتمل ہو وہ کافی ہے۔ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آخری کلمات تھے۔ اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ۔ (اے اللہ بہترین مقام عطا فرما۔)

امامؒ نے یہ کتاب عمل کرنے کے لئے بنائی اور عمل کا مدار نیت ہے۔ اور اعمال کی انتہا روز قیامت وزن پر ہے۔ اس لئے کتاب کا آغاز بھی امام بخاریؒ نے نیت کی اہمیت والی حدیث سے کیا یعنی :

انما الاعمال بالنیات وانما لامرئ مانوی	اعمال کی فضیلت اور قبولیت کا دارو مدار
فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ ومن	نیات پر ہے۔ انسان کو نیت کا ثمرہ ملتا
کانت ھجرتہ الی دنیا یصیبھا او الی	ہے جس نے اللہ اور اس کے رسول کی خاطر
امرأۃ ینکحھا فھجرتہ الی ماھاجر الیہ	ہجرت کی وہ واقعی ایسی ہو گی اور جس نے

حصول دنیا یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے خیال سے ہجرت کی تو اسکی ہجرت اپنی غرض دنیوی ہی کیلئے ہو گی۔ (یعنی اللہ کی طرف سے اس کا اجر نہ ملے گا۔)

امام بخاریؒ نے اشارہ فرمایا کہ تمام اعمال و احکام کا مبدأ اور مدار وحی ہے۔ اور وہی عمل و حکم صحیح قرار پائے گا جو وحی سے مستنبط ہو۔ اور جو وحی سے مستنبط نہ ہو وہ غلط ہوگا۔ اور اعمال و احکام کا مدار و مبدأ اور اس کا بارگاہ ایزدی میں مقبول ہونا نیت کی خلوص اور تصحیح پر موقوف ہے۔ اگر نیت خالصۃً للہ اور اسکی رضامندی کا حصول ہو تو وہ عمل اللہ کے ہاں شرف قبول پائے گا۔ تصحیح نیت کے بعد اعمال کی انتہا وزن پر ہے۔ جس پر سعادت و کامیابی دارین و فوز آخرت ہے۔ اور جب نیت درست ہو تو اعمال حسنہ کا وزن بھی بھاری ہوگا۔ خلاصہ کتاب یہ ہے۔ کہ جب مسلمان کا عمل اور حکم وحی سے مستنبط ہو اور عامل کی نیت صحیح ہو تو قیامت کے دن اس کے اعمال کا وزن بھاری ہوگا۔ اور یہ شخص اپنے مقصد حیات رضائے خداوندی کو پائے گا۔ مصنفؒ نے اس حدیث کو آخر کتاب میں لاکر اللہ تعالیٰ کے اس عظیم احسان و اکرام کا شکریہ ادا کرنا چاہا کہ اس نے اپنے محبوب نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احادیث جمع کرنے کی توفیق دی۔ اور پھر ہم گنہگاروں کو بھی اس کے پڑھنے اور سننے کا موقعہ عطا فرمایا۔ حدیث میں شغل موجب سعادت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر خداوند کریم کا بے پایاں فضل و کرم نہ ہوتا تو ہم بول و براز کے کیڑے اور گندگی کے حشرات ہوتے۔ یہ اس کا کرم ہے۔ کہ ہمیں اس نے اشرف المخلوقات یعنی انسان بنایا پھر ہمیں اپنے رسول کریم کی احادیث پڑھنے پڑھانے کی توفیق دی۔ اگر ہماری تمام عمر اس نعمت کے عوض اسکی سجدہ ریزی اور تشکر میں گذر جائے تب بھی اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

سلسلۂ سند حدیث اور اجازت

مجھے بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث کے پڑھنے اور پڑھانے کی اجازت میرے آقاد مولیٰ حضرت شیخ العرب والعجم شیخ الاسلام مجاہد اعظم مرشد العالم مولانا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ العزیز نے دیوبند میں دی۔ یہ سب کچھ خداوند کریم کا احسان ہے۔ اور اس کے بعد اس مشفق و مہربان استاد کی برکت اور دیگر اکابر سلسلہ کا فیض ہے۔ کہ جو کچھ ہمیں ملا انہیں کے ذریعہ سے ملا۔ اللہ تعالےٰ حضرت شیخؒ کے مرقد پاک کو مرکز انوار و برکات بنا دے۔ حضرت شیخ الاسلام شیخ العرب والعجم مولانا مدنیؒ کی کرامات ظاہرہ میں سے یہ مشاہدہ ہے کہ جن لوگوں کو ان کی صحبت و مجلس کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔ وہ آج دینی امور کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ اور مجھ جیسا گنہگار، حقیر اور ناچیز بے علم شخص کو بھی اس نسبت سے اس مقدس مشغلہ کی سعادت حاصل ہے۔ حضرت شیخ درس حدیث کے وقت احادیث کا حق ادا کرتے۔ کبھی ان کو اس میں وقت کی تنگی یا کثرت سوالات وغیرہ

سے پریشانی اور ملال نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ کبھی ان پر پڑھانے کی عجلت تھی ——— شروع کے اسباق اور آخر کے نہایت اطمینان سے پڑھاتے تھے۔ کبھی وقت کی تنگی کی وجہ سے خدمت حدیث کے حق ادا کرنے میں تعجیل سے کام نہ لیتے۔ حلم کی یہ حالت تھی۔ کہ جب طلبہ بے جا اعتراضات کرنے لگتے تو حضرت حسن بصریؒ کی طرح "خلق الانسان من عجل" کہہ دیتے۔ (یعنی انسان عجلت سے پیدا کیا گیا۔)

احادیث کی مکمل لغوی وفقہی اور فنّی تشریح اختلاف مذاہب اور مذہب احناف کی تائید و تقویت عجیب وغریب پیرایہ میں کرتے۔ غرض سلف سے جتنے آداب و شرائط درسِ حدیث کے لئے منقول ہیں۔ وہ ان میں بدرجۂ اتم پائے جاتے تھے۔ حضرت شیخ الاسلام علیہ الرحمۃ کا سند یہ ہے ———

حدثنی سیدنا و شیخنا و مولانا حسین (۱)	مجھے حضرت شیخ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے
احمد مدنیؒ قال حدثنا شیخ الھند	حدیث کی اجازت دی۔ انہوں نے حضرت
مولانا محمود (۲) الحسن الدیوبندیؒ	شیخ الہند مولانا محمود الحسن سے حاصل کی۔
قال حدثنا الشیخ الامام محمد (۳) قاسم	شیخ الہند نے الشیخ الامام محمد قاسم النانوتوی
النانوتویؒ والشیخ رشید (۴) احمد الگنگوہیؒ	اور شیخ رشید احمد الگنگوہی سے ان دونوں
قالا حدثنا الشیخ الشاہ عبد (۵) الغنی المجددیؒ	حضرات نے شاہ عبد الغنی مجددی سے انہوں
المھاجر المدنی قال حدثنا الامام الحجۃ	نے شاہ محمد اسحاق الدہلوی سے۔ اور
الشاہ محمد اسحاق (۶) الدھلویؒ قال	شاہ محمد اسحاق نے شاہ عبد العزیز الدھلوی
حدثنا الشیخ الاجل الشاہ عبد العزیز (۷)	سے حضرت شاہ عبد العزیز نے اپنے والد
الدھلویؒ قال حدثنا الامام الحجۃ	اور شیخ الامام الحجۃ شاہ ولی اللہ الدہلوی سے
الشیخ الشاہ ولی اللہ الدھلوی رحمھم اللہ تعالیٰ اسلہ	روایت و اجازت حدیث حاصل کی۔

---

(۱) ولادت ۱۲۹۶ھ وفات ۱۳۷۷ھ (۲) ۱۲۶۸ھ تا ۱۳۳۹ھ (۳) ۱۲۴۸ھ تا ۱۲۹۶ھ (۴) ۱۲۴۴ھ تا ۱۳۲۳ھ

(۵) یہ شاہ عبد الغنی مجددی حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادہ نہیں بلکہ ان کا نسبت نامہ حضرت مجدد الف ثانی سے ملتا ہے۔ شاہ عبد الغنی بن شاہ ابو سعید بن شاہ شفیع القدر بن شاہ محمد معصوم بن حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ ان کا سنِ ولادت ۱۲۳۵ھ ہے اور وفات ۱۲۹۵ھ مدینہ طیبہ میں ہوئی۔ (۶) ۱۱۹۷ھ تا ۱۲۶۲ھ (۷) ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ (۸) ۱۱۱۴ھ تا ۱۱۷۶ھ ——— (ادارہ)

اسلہ (حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

امام المحدثین حضرت شاہ ولی اللہ الدہلوی رحؒ سے امیر المؤمنین فی الحدیث امام بخاری اور الامام الاجل
الشیخ الترمذی تک سلسلہ سند مشہور و معروف اور اوائل کتب حدیث میں مذکور ہے۔ اور ان حضرات
سے حضور اقدس آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم تک راویوں کا سلسلہ ہر حدیث شریف کے ساتھ بیان ہوتا ہے۔

سند کی حقیقت

ان حضرات اکابر و مشائخ کے ذریعہ جو اجازت روایت حدیث حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحؒ نے دی وہی حضرت شیخ رحؒ کی اجازت تمہیں
دیتا ہوں۔ میں تو خود ایک ناچیز اور ہر لحاظ سے کم سواد ہوں۔ اجازت کا مطلب یہ ہے کہ اعطاء علوم و
فیوض خداوند تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ اور واسطہ تمام علوم کی تقسیم کا نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں۔
حضورؐ کا ارشاد ہے۔ انما انا قاسم واللہ معطی۔ (میں تقسیم کرنیوالا ہوں اور اللہ تعالیٰ دینے والے ہیں)
درمیان میں اساتذہ محدثین سلسلہ اور زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں جسطرح ایک کھیت کو دریا سے
پانی نالہ کے ذریعہ سے پہنچتا ہے۔ نالہ نہ ہو تو اس کی سیرابی مشکل ہے۔ اسطرح اساتذہ مشائخ روایت
حدیث بھی ایک میزاب کا کام دیتے ہیں۔ سند کے ذریعہ سے حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام سے
طلبہ حدیث کی کڑی لگ جاتی ہے۔ اور رابطہ قائم ہو جاتا ہے۔ اس لئے شاہ ولی اللہ کے دور تک اکثر
متقدمین کے ہاں تعلیم حدیث کا یہ طریقہ رہا کہ حدیث کی عبارت کی سماعت و قرارت اور روایت کے
اتصال کیلئے محض سرد الحدیث کا طریقہ رائج تھا۔ یہ حدیث کا ایک طریقہ ہے جو اہم ہے۔ اور
دوسرا طریقہ یہ کہ حضور اقدسؐ سے سلسلہ متصل ہو فقہی و لغوی تحقیق کو زیادہ اہمیت نہ تھی۔ اب تمہارا تعلق
اور رابطہ سلسلۂ حدیث سے قائم ہو چکا ہے۔ اور علوم نبویہ کے سمجھنے اور مطالعہ کرنے کے لئے ایک
راہ کھل گئی ہے۔ آگے تم لوگوں کا کام ہے کہ اپنے استعداد سے کام لیکر اس میں تبحر اور وسعت مطالعہ
پیدا کریں۔ یاد رکھیں اپنے آپ کو ہرگز نہ عالم سمجھیں اور نہ حصول علم میں عار و شرم محسوس کریں یہ اجازت
بھی ان شرائط و آداب کے ساتھ مشروط ہے۔ جو اکابر سلف نے حدیث کے بیان اور درس و تدریس

(حاشیہ صفحہ ۔) حضرت شیخ کے چند اور سلسلے بھی درج ذیل ہیں۔ ۱۔ اخبرنی الشیخ حسین احمد المدنی عن الشیخ
محمود الحسن الدیوبندی عن العلامہ محمد مظہر النانوتوی رحؒ و مولانا النقاری محمد عبدالرحمان الفانی فتی۔ کلاھما عن الشاہ محمد اسحاق رحؒ
الی آخرہ۔ ۲۔ قال شیخنا الحسین احمد المدنی اروی ھذہ العلوم عن الشیخ الاجل مولانا عبدالعلی وعن الشیخ الاجل مولانا
خلیل احمد السہارنفوری کلاھما عن مولانا رشید احمد الگنگوہی و مولانا محمد قاسم الی آخرہ۔ ۳۔ قال الشیخ الاجل وادوی
عن مشیخۃ اعلام من الحجاز اجازۃً وقراءۃً لاوائل بعض الکتب اجلّھم شیخ التفسیر حسب اللہ الشافعی المکیؒ و مولانا عبدالجلیل
براداۃ المدنی و مولانا عبدالسلام الداغستانی مفتی الاحناف بالمدینۃ المنورہ و مولانا السید احمد البرزنجی مفتی الشافعیۃ بالمدینۃ المنورہ
رحمہم اللہ تعالیٰ ـــــ

کے لئے ضروری قرار دی ہیں۔ جب تک اس کے سمجھنے کی پوری صلاحیت و کوشش نہ ہو اور اطمینان و تسلی نہ ہو جائے فہم حدیث میں اپنی رائے سے کام نہ لیں حضرت امام مالکؒ سے چالیس مسائل کے بارہ میں دریافت کیا گیا مگر انہوں نے ۳۶ مسائل کے بارہ میں لا ادری (مجھے معلوم نہیں) کہہ کر معذرت کر دی تو آپ کو بھی عدم علم کے وقت لا ادری کہنے میں کوئی عار نہیں ہونی چاہئے۔ اور اختلافات اور جھگڑوں سے سکوت کریں۔ امام بخاری علیہ الرحمۃ جب نیشاپور تشریف لائے اور لوگوں نے مسئلہ خلق قرآن کے متعلق دریافت کرنا چاہا تو تین دن تک جواب دینے سے گریز کرتے رہے۔ کہ اختلافات میں نہ پڑیں۔ آخر محمد بن یحی الذھلی نے کہلوایا کہ لفظی بالقرآن مخلوق حضرت امام ابو حنیفہؒ تلامذہ کو رخصت کرتے وقت نصیحت کرتے کہ اپنے ہاں کے علماء کی قدر کیا کرو۔ وہ اپنا ایک حلقۂ اثر رکھتے ہیں۔ جو تمہارے پاس نہیں ہوتا ان کا احترام کرو۔ انہیں آگے رکھو اور اگر کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو فوراً میرا مذہب اور قول بیان نہ کرو بلکہ کئی علماء کے اقوال پیش کر دو اور اس کے بعد میری رائے بھی پیش کر دو۔ حضرت امام اعظمؒ کا یہ مطلب نہ تھا کہ ناجائز کی تائید کرو بلکہ حق بات پہنچانے اور تبلیغ کرنے کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ ہمارے ملک میں تبلیغ اختلافات اور فتنہ انگیزیوں میں بڑھ کر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ بہت بڑی حکمت، میانہ روی، نرمی اور تحمل کی ضرورت ہے۔ اس ملک میں قادیانی، پرویزی بلکہ عیسائی تک اپنے باطل مذاہب کی اشاعت کے لئے نرمی، شفقت، خدمت اور محبت کے تمام ذرائع استعمال کرتے ہیں ——————

بقیہ :- اسلام کی عالمگیری اور جامعیت

ہے۔ ("حقائق" ج ۷، ص ۱۰۱ تا ۱۰۵)

کیا ایسا مشکوک، مبہم اور محرّف دین عالمگیر ہو سکتا ہے۔ اس کے برخلاف اسلام کا یہ حال ہے۔ کہ قرآن آغاز نزول سے اب تک حافظہ اور تحریر دونوں صورتوں میں محفوظ رہا۔ اور اب تک ہے۔ اور ایک زبر یا زیر کا فرق ہو جائے تو لاکھوں حافظ چلا اٹھتے ہیں۔ کہ یوں نہیں یوں ہے۔ تمام عالم کے قرآن کے نسخے یکساں رہے ہیں۔ اور کوئی فرق ان میں کسی دور میں نہیں پایا گیا۔ یہی قرآن کے دوام اور محفوظیت کی واضح دلیل ہے۔ جو اسلام کے عالمگیر ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

بحث و تمحیص

حضرت مولانا سعید الدین صاحب شیر کوٹی پشاور

قابلِ توجہ اربابِ علم و اصحابِ فتویٰ

بیمۂ زندگی کی حقیقی صورتِ حال

"الحق" میں بیمۂ زندگی کے متعلق مضمون نظر سے گذرا۔ یہ مسئلہ اپنی گوناگوں اقسام پیچیدہ نوعیت اور بیمے کی حقیقت کما حقہ' واضح نہ ہو سکنے کی بنا پر ابھی تک تنقیح طلب ہے۔ گذشتہ دنوں مجھے اس مسئلے کے مطالعے اور معلومات کی نوبت آئی۔ میرے خیال میں اولاً اس چیز کی ضرورت ہے۔ کہ بیمے کی حقیقی صورتِ حال اور اصل صورتِ مسئلہ واضح طور پر سامنے آجائے۔ جس کے بعد اسکی شرعی حیثیت کا تعین سہل ہو جائے گا۔ اور صحیح نتیجہ اخذ کیا جا سکے گا۔ سطور ذیل میں مَیں "بیمۂ زندگی" کے متعلق اپنی معلومات کا خلاصہ پیش کئے دیتا ہوں۔ جو بیمہ کمپنیوں کے قواعد و طریق عمل کا بغور مطالعہ کرنے، بیمہ کے نظام پر نظر ڈالنے اور بعض بیمہ کمپنیوں کے ذمہ دار اشخاص سے تبادلۂ خیال اور حقیقی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کے نتیجے میں مجھے حاصل ہوئی ہیں۔ بالاختصار و بلا تبصرہ صورتِ مسئلہ یہ ہے:

(۱) ا۔ انشورنس کمپنیاں بیمہ کرانیوالے کو اپنے ادارے کا سرمایہ کار اور حصہ دار تصور کرتی ہیں۔ اور اپنے حصہ داروں کو ضوابط کے تحت تکلیف اور دشواری کے وقت امداد دینے کا مقصد بھی پیش نظر رکھتی ہیں۔ اور ایک منظم طریق کار کے تحت امداد دے سکنے کی صورت پیدا کرتی ہیں۔ بایں طور کہ کچھ رقم زرِ بیمہ کے علاوہ ہر قسط کے ساتھ ہر رکن (حصہ دار) سے حاصل کی جاتی ہے۔ اور کچھ رقم کمپنی کے تجارتی منافع میں سے حسبِ ضوابط و قبولیتِ ارکان لی جاتی ہے۔ یوں گویا تمام ارکان کے اشتراک سے ایک "امدادی مد" قائم ہو جاتی ہے۔ جس سے خاص حالتوں میں مقررہ ضوابط کے مطابق اپنے ارکان کو سہولت و امداد پہنچائی جاتی ہے۔ یہ گویا کمپنی کے کام کا ایک امدادی پہلو ہے۔ جس کو کمپنی کی تجارت کے منافع سے اور ارکان سے اس مقصد کیلئے حاصل شدہ "زائد رقم" سے مرتب کیا گیا ہے۔

ب ۔ بیمہ کمپنیاں اپنے ارکان کی رقوم ایک معینہ مدت اور ضابطے کے تحت لیتی ہیں۔

تجارت میں لگاتی ہیں۔ اور منافع دیتی ہیں۔ لیکن شرح منافع پہلے سے متعین و مقرر نہیں ہوتی۔ کسی سال کا منافع کم ہوتا ہے۔ کسی سال کا زائد۔ یہ دورانِ سال کمپنی کی تجارت سے حاصل ہونیوالے نفع کی کمی بیشی پر منحصر ہوتا ہے۔

ج۔ ہر سال کے اختتام پر کمپنی کے حاصل کردہ منافع کی بنا پر حصہ داروں کو پہنچنے والے نفع کی نسبت و شرح کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کہ حصہ داروں کو اس نسبت و شرح سے نفع ملا۔ یہ قبل از وقت کسی شرح منافع کا تعین نہیں ہوتا۔ بلکہ حاصل شدہ نفع کی شرح کا اعلان و بیان ہوتا ہے۔

د۔ رقم بیمہ (سرمایہ) کے تفاوت کے مطابق حصہ منافع بھی حسب نسبت متفاوت ہوتا ہے۔

ھ۔ کمپنی اپنا تمام منافع پورے طور پر شرکا میں تقسیم نہیں کرتی بلکہ ایک مقررہ نسبت "امدادی مد" کیلئے وضع کی جاتی ہے۔ جس کا ذکر شق ا میں بھی کر چکا ہوں۔

و۔ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار بہت وسیع پیمانے، مملکتی اعانت اور بڑے وسائل کے تحت عمل میں آتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی سرمائے کی ایک خاصی مقدار "سرمایۂ محفوظ" کی صورت میں حکومتی تحویل میں رکھی جاتی ہے۔ تاکہ نقصان اور خسارے کی صورت میں کام آئے، اس لئے صرف بہت ہی عظیم تجارتی حادثات و بحران کی صورت میں نقصان کی نوبت آتی ہے۔ ورنہ نفع ہی زیادہ متیقن ہوتا ہے۔

ز۔ تاہم امکان خسارے کا بھی ہے۔ ایسی صورت میں کہ کمپنی خسارے کی زد میں آجائے اور دیوالیہ ہی ہو جائے تو اس نقصان میں بھی حصہ داروں اور بیمہ کرانے والوں کو شریک ہونا پڑتا ہے۔ اور کمپنی کی بچی بچائی مالیت ہی ارکان میں باعتبار تفاوت نسبت مالیت ارکان، ارکان میں تقسیم ہو گی۔ جیسے بنک وغیرہ فیل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔

ح۔ بیمۂ زندگی میں یہ بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ کہ منافع کو سود کے شبہ کی بنا پر چھوڑ دیا جائے۔ اور بیمہ کرانے والا ایک مقررہ مدت تک واپس نہ لینے کی شرط پر رقم جمع کراتا رہے۔ اور متعینہ زائد رقم (جو امدادی مد میں کام آتی ہے۔) دیتا رہے۔ تو اسے بھی "امداد" کی سہولت دی جائے گی۔ کیونکہ امدادی سکیم کا رکن یہ بھی ہے۔

(۲) ا۔ قمار میں رقم کا ملنا مجہول صورت پر موقوف ہوتا ہے۔ اور شرط طرفین سے ہوتی ہے لیکن بیمۂ زندگی میں صورت معاملہ معلوم ہے۔ اور طرفین سے شرط نہیں ہے۔ صرف یکطرفہ صورت ہے۔ کہ اگر بیمہ کرانے والا دوران حصہ داری فوت ہو گیا تو کمپنی اپنے اقرار معاونت کے تحت مقررہ رقم ادا کرے گی۔ اس کے برعکس اگر بیمہ کرانے والا فوت نہ ہوا تو اسے کوئی رقم دینی اور خسارہ اٹھانا نہیں پڑتا۔

ب - حادثات، آتشزدگی اور مال وغیرہ کا بیمہ بیشک طرفین سے تعلق رکھتا ہے۔ اور اس میں امر اتفاقی پر فریقین میں سے ایک کو بے وجہ نقصان اور دوسرے کو بغیر جائز استحقاق کے نفع پہنچتا ہے۔ یہ صورت قمار ہے۔

(۳) بصورت فوتیدگی رقم پانے کے لئے جس شخص کو نامزد کیا جاتا ہے۔ اگر بیمہ کرانے والا شرعی قانونِ وراثت اور ورثاء کے حقوق کا لحاظ رکھے تو بیمہ کمپنی کے ضوابط کی طرف سے کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ اس لئے کہ :-

ا۔ شخص مذکور ورثاء ہی میں سے نامزد کیا جاتا ہے۔ اور اس نامزد شخص کی حیثیت بیمہ کرانے والے کے معتمد اور وکیل و وصول کنندہ کی بھی ہوسکتی ہے۔ اُسے رقم کا مالک اصلی ہی قرار دینا ضروری نہیں۔

ب - یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک ہی شخص کو نامزد کیا جائے۔ کئی اشخاص (ورثاء) کو بھی نامزد کیا جاسکتا ہے۔

ج - کمپنی نامزدگی اس بناء پہ کرواتی ہے۔ کہ بروقت امداد کا مقصد بآسانی حاصل ہوسکے اور پسماندگان کو قانونی اشکالات کی وجہ سے امدادی رقم حاصل کرنے میں دشواری پیش نہ آئے اب یہ بیمہ کرانے والے کی ذمہ داری ہے۔ کہ وہ صحیح معتمد کو نامزد کرے اور معتمد کا فرض ہے۔ کہ حق شناسی اور حدودِ شرعی کا پابند رہے۔

(۴)۔ بیمہ کمپنیوں کے کاروبار (جن میں کمپنیاں روپیہ لگاتی ہیں) بیشک سودی لین دین اور بنوعیت قمار وغیرہ بھی ہوتے ہیں۔ جو حرام و ناجائز ہیں۔ اس سلسلے میں دو امور غور طلب ہیں :-

ا۔ اگر رقم دینے والا تجارت کے نفع میں شریک نہ ہو تو بھی اس کی کمپنی میں شرکت معاونت علی الاثم ہوگی یا نہیں ؟ اگر نہیں تو "بلا نفع بیمۂ زندگی" درست قرار پاسکتا ہے۔ ؟

ب۔ اگر شرکت منافع کے بغیر بھی شرکت ناجائز ہے۔ تو بنک میں بلا سُود حساب کھولنے کا حکم کیا ہے۔ ؟ کیونکہ بنک میں جمع کرائی جانے والی رقوم بھی ناجائز کاروبار میں لگائی جاتی ہیں۔

امید ہے۔ ان تصریحات و معلومات سے اہل علم کو بیمۂ زندگی کی شرعی حیثیت متعین کرنے میں مدد مل سکے گی۔ اور اس باب میں قطعی حکم لگایا جاسکے گا۔

شکریۂ معاونین

الحق کی ترقی و استحکام اور اس کے حلقہ اشاعت کی توسیع کے لئے کئی دینی درد رکھنے والے احباب اور بزرگوں نے سعی فرمائی اور اس آوازۂ حق کے فروغ کے لئے اپنے حلقۂ اثر سے خریدار مہیا فرما دئے۔ اس سلسلہ میں ریاست سوات کے جلیل القدر عالم اور محکمہ قضا کے ماہر اور جید قاضی مولانا عزیز الرحمن فاضل دیوبند کا اسم گرامی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جنہوں نے الحق کی توسیع میں حصہ لیکر کافی خریدار مہیا فرمائے اور شفقت و محبت کی بنا پر آئندہ بھی ہر قسم کے تعاون کی پیشکش کی۔ اس کے علاوہ جو حضرات سعی بلیغ فرما کر تبلیغ دعوت حق کے فروغ کا ذریعہ بنے ان میں سے بھی بعض کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کی مساعی کو دین کی اشاعت اور آخرت کیلئے صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنا دے ـــــــ

۱۔ جناب مولانا عزیز الرحمٰن صاحب۔ محکمہ قضا سیدو شریف سوات سٹیٹ	۳۲ خریدار
۲۔ جناب مولانا قاری عبد الغفار۔ فاضلِ دار العلوم حقانیہ خطیب درہ آدم خیل	۱۳ "
۳۔ جناب رفیق احمد صاحب اوورسیر پی۔ ڈبلیو۔ ڈی۔ پشاور	۱۳ "
۴۔ جناب سید نوح بادشاہ صاحب۔ کوہاٹ	۶ "
۵۔ جناب اقبال احمد صاحب۔ تربیلہ ڈیم	۷ "
۶۔ جناب مولانا ڈاکٹر محمد عمر صاحب۔ فاضلِ حقانیہ شہباز گڑھ	۵ "
۷۔ جناب محترم قنبرانی صاحب۔ بیراج کالونی حیدرآباد سندھ۔	۴ "
۸۔ جناب نعمت گل صاحب خٹک ایگزیکٹو انجینئر مردان۔	۳ "
۹۔ حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہٗ ٹنڈوالہ یار سندھ۔	۲ "

۱۰۔ جناب مولانا عبد الحمید صاحب خطیب و جناب ماسٹر جمال الدین صاحب بنوں۔ (جن کی سرگرم مساعی سے بنوں میں پرچہ کی اشاعت تقریباً ایک سو تک پہنچ گئی۔)

۱۱۔ جناب مولانا محمد اسرائیل صاحب فاضلِ حقانیہ۔ شیر پاؤ۔	۴ خریدار
۱۲۔ جناب مولانا فضل دیان صاحب فاضل حقانیہ۔ عمرزئی۔	۳ "
۱۳۔ مولانا محمد کریم افغانی فاضل حقانیہ۔ ڈاگ	۳ "

قارئین الحق توجہ فرمادیں

جن حضرات (فضلاء دار العلوم اور عام احباب) کے پاس ماہنامہ الحق پہنچ رہا ہے اور انہوں نے اب تک اپنا سالانہ چندہ خریداری ارسال نہیں فرمایا براہ کرم اولین فرصت میں اپنا چندہ ارسال فرمادیں نیز فضلاء دار العلوم اور عامۃ المسلمین حضرات سے خصوصی اپیل ہے کہ اپنے حلقہ میں الحق کیلئے خریدار مہیا فرمادیں۔ الحق کے فروغ و ترویج میں حصہ لینا ایک مرکز علمی کے استحکام اور دعوت حق کے ایک ترجمان کی کامیابی ہے جو دین اسلام کی خدمت اور تبلیغ دین کا بہترین ذریعہ ہے۔

REGD :— L. No. 7681

(۱) "الحق" ، ہر انگریزی مہینہ کے پہلے ہفتے میں شائع ہوتا ہے۔

(۲) جن حضرات کو ۲۰ تاریخ تک بھی پرچہ نہ ملے تو وہ نمبر خریداری کے حوالہ سے ۲۸ تاریخ سے قبل دوبارہ رسالہ منگوا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا

(۳) جملہ امور کے لئے خط و کتابت مینجر رسالہ سے کی جائے۔

(۴) جملہ مضامین یا تبصرے کی کتابیں مدیر رسالہ کے نام ارسال کی جائیں۔

(۵) جملہ مضامین یا تبصروں کی اشاعت ادارہ کے صوابدید پر ہوگی۔

(۶) الحق میں شائع شدہ مضامین بلا اجازت، رسائل یا کتابی شکل میں شائع نہ ہو سکیں گے۔

(۷) جملہ خط و کتابت اور منی آرڈر کے کوپن پر اپنا پورا پتہ اور نمبر خریداری لکھنا چاہیئے۔

دفتر ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک (پشاور) مغربی پاکستان